سلسلۂ آصفیہ کا تیسرا انتخاب

خزینۂ اُردو

مؤلفہ

جناب مولوی حافظ سیّد جلال الدین احمد جعفری زینبی
عربی فارسی پروفیسر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد

جسکو
نصاب کمیٹی حیدرآباد دکن نے تھرڈ فارم کے لئے تجویز فرمایا

سنہ ۱۹۲۴ء

منشی محمد اسمٰعیل مینجر مطبع کے
اہتمام سے
مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد میں طبع ہوا

بار دوم
قیمت فی جلد ۱۲

رباعیات حکیم عمر خیام

معہ

شرح و ترجمہ اردو

مشرحہ

جناب مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری زینبی

معہ مقدمہ

جسمیں حکیم عمر خیام کے حالات اور اُنکی رباعیوں کی خصوصیات اور باعتبار مضامین کے اس کے اقسام بیان کیے گئے ہیں۔

اسی تقطیع پر سفید چکنے و بیز کاغذ پر نہایت خوشخط اور صاف چھپکر تیار ہے۔ قیمت فی جلد عسہ

ملنے کا پتہ

منیجر انوار احمدی پریس

الہ آباد

فہرست مضامین

نثر

عنوان مضامین و اسمائے مصنفین	صفحہ
زبان اردو کی حقیقت۔ از منشی عبد الغفور نساخ۔	۱
تربیت اطفال۔ از سر سید احمد خاں۔	۶
تعلیم۔ شمس العلما مولوی نذیر احمد دہلوی	۱۰
تعلیم کی ضرورت ایضاً	۱۲
تعلیم مروجہ میں کس چیز کی کسر ہے۔ ایضاً	۱۴
محنت۔ مولوی سید مرتضیٰ از رسالۂ تدبیر	۱۸
کمال بے محنت کے حاصل نہیں ہوتا۔ از شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔	۲۸
زبان گویا۔ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی۔	۳۴
زمانۂ حال اور ماضی کی خوش بیانی۔ از منشی [illegible] از رسالۂ فن تقریر	۳۶
خوش خلقی و نیک چلنی ایضاً	۴۲
مضمون نویسی۔ از شوکت۔	۴۴
کفایت۔ مرزا عابد حسین صاحب۔ بی۔ اے۔	۴۶
کتب کا مطالعہ۔ از مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔	۴۹
سفر۔ مولوی حامد حسین رضوی	۵۳
تمدن۔ مولوی عبد الرحمن۔ بی۔ اے	۶۰
ترقی کا اعلیٰ ذریعہ تجارت ہے۔ از سر سید احمد خاں۔	۶۹
تجارت کا اثر اخلاق پر۔ سید محمود دہلوی	۷۰
آنے والی گھڑی۔ مولوی عبد الحلیم شرر لکھنوی۔	۷۷
صبح۔ شرر لکھنوی۔	[illegible]
تدبیر اور امید۔ نواب محسن الملک۔	۸۵
گلشن امید کی بہار۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد دہلوی۔	۸۸
ناامیدی۔ منشی لطیف احمد مینائی بی۔ اے۔	۱۰۰
عزت۔ نواب محسن الملک۔	۱۰۴
شہرت۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا۔	۱۱۰

عنوانِ مضامین و اسمائے مصنفین	صفحہ
پنچی منشرت - شرر لکھنوی -	۱۱۴
خطوط - از موعظت حسنہ - مولوی نذیر احمد دہلوی	۱۱۸
نظم	
قصائد	۱۴۰
حمد باری تعالیٰ - مومن خاں مومن -	۱۴۰
زمانے کا انقلاب - ایضاً	۱۴۲
قصیدہ مدحیہ - شیخ محمد ابراہیم ذوق -	۱۴۳
قصیدہ مدحیہ - ایضاً	۱۴۴
قصیدہ - منشی امیر احمد امیر مینائی -	۱۴۶
غزلیات	۱۴۸
میر - درد - سودا - مومن - انشا - ناسخ - آتش - ذوق - ظفر - امیر داغ - تسلیم - حالی - اکبر	
ترکیب بند	۱۵۹
ایک پرندے کی فریاد - اقبال - ایم - اے -	
قطعات	۱۶۱
میر - آشفتہ - نظیر - ناسخ - سوز - سودا - ظفر - ذوق - مومن - مصحفی - آتش - تراب -	

عنوانِ مضامین و اسمائے مصنفین	صفحہ
رقعات - غالب -	۱۳۵
رقعات - منشی غلام غوث بیخبر	۱۳۳
مثنویات	۱۶۴
حمد باری تعالیٰ - نواب شوق -	۱۶۴
مناجات - سودا -	۱۶۴
حمد - ذوق -	۱۶۶
دریائے عشق - میر تقی میر	۱۶۷
حب وطن - حالی -	۱۶۸
موسم زمستان - آزاد دہلوی -	۱۸۹
مسدسات	۱۹۴
صبح کا سماں - انیس -	۱۹۵
ایضاً ایضاً	۱۹۶
گھوڑے کی تعریف - انیس -	۱۹۸
تلوار کی تعریف - انیس -	۱۹۸
رباعیات	
داغ - امیر - انیس - حالی - اکبر -	۱۹۹

معززّ مدرسین

میں نے اس سے پہلے بہت سے انتخابات تیّار کیے جو اکثر صوبوں میں پسند آئے اور اسکولوں کے نصاب تعلیم میں داخل کئے گئے۔ مگر حال میں میں نے اردو انتخابات کا ایک سلسلہ تیّار کیا ہے جس میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ ایک کے پڑھنے کے بعد دوسرے انتخاب کے پڑھنے کی استعداد پیدا ہو اور ایک سے ایک مشکل ہو تاکہ طلباء کی استعداد میں خاص ترقی ہوتی رہے۔ اور اسکول کی تعلیم ختم کرلینے کے بعد اردو زبان کا صحیح طور پر لکھنا۔ پڑھنا۔ بولنا۔ سمجھنا آجائے!

مگر جب تک آپ لوگ خاص دلچسپی سے طلبار کو نہ پڑھائیں گے۔ اسوقت تک ان کی پوری توجّہ اس طرف نہ ہوگی اور کامل استعداد پیدا ہونے کی اُمّید نہیں کی جاسکے گی۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی خدمت میں حسب ذیل التماس کرنا چاہتا ہوں۔ اُمّید ہے کہ میرا یہ التماس ناگوارِ خاطر نہ ہوگا۔ اور اس کی پابندی کے ساتھ آپ لوگ طلبا کو تعلیم دینگے۔ تاکہ اس انتخاب سے جو میرا اصل مقصود ہے وہ حاصل ہو۔ اور میری محنت ٹھکانے لگے۔

۱۔ جو سبق آپ پڑھائیں پہلے خود پڑھکر طلبا کو سنائیں اور اس میں تواتر صوت و حصر الصوت۔ تغیرِ لہجہ کے اصول کو مدِّ نظر رکھیں۔ پھر طلبا سے اسی طور پر پڑھوائیں اور اس کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ الفاظ صحیح پڑھیں۔ اضافات کا خیال رکھیں۔ فقروں اور جملوں کے اختتام پر طلبا بقدر ضرورت توقف کریں۔ رفتار خواندگی بہت زیادہ تیز یا بالکل سست نہ ہو۔

۲۔ تمام مشکل الفاظ اور اصطلاحات کے معانی تختۂ سیاہ پر مختصراً لکھکر طلبہ کو نوٹ کرادیجئے۔ اور واضح طور پر اُن کو سمجھا دیجئے۔

۳۔ مرکّب الفاظ کی تشریح کیجئے۔ عربی اسما کی جمع اور مادّے بتلائیے۔

۴۔ ہر فقرے اور جملے کا مطلب اور مضمون کا خلاصہ طلبا کے ذہن نشین کرائے اور اس کو ایسے طور پر کیجئے کہ وہ خود بھی یہ سب کچھ بخوبی کر سکیں۔ قوت بیان اُن میں پیدا ہو جائے۔

۵۔ تمام اشعار کا مطلب آسان الفاظ میں اُن کو سمجھانا چاہئے اور اُن سے خود کہلا دینا چاہئے۔

۶۔ تمام تلمیحات جو اس مضمون یا شعر سے متعلق ہوں اور مصنفین کی مختصر سوانح عمریاں اُن کو بتلائیے۔

۷۔ اقسام نظم و نثر سے بھی طلبا کو واقف کر دینا ایک ضروری امر ہے۔

۸۔ اس کتاب کے ہر مضمون کے اختتام پر چند مفید سوالات دے دیئے گئے ہیں۔ ان سوالات کو اور اسی طرح کے اپنی طرف سے چند سوالات طلبا سے وقتاً فوقتاً حل کرائے۔ تاکہ جو مضمون پڑھیں اُس کی صرف عبارت پر نظر نہ رہے بلکہ وہ مضامین اُن کے دماغ میں جم جائیں۔ اور ان کی مدد سے اونچے کلاسوں میں بخوبی مضمون نویسی کر سکیں۔

۹۔ مراتب بالا تا امکان طلبا سے نکلوائیں۔ جس لفظ۔ فقرے یا جملے کے معنی یا خلاصہ مضمون وغیرہ کو درجے کا کوئی طالب علم نہ کہہ سکے اُس کو آپ بتلا دیں۔

۱۰۔ میری آخری گذارش یہ ہے کہ آپ لوگوں کو ایسی توجہ سے پڑھانا چاہئے کہ طلبا کو اچھی استعداد پیدا ہو جائے اور اُن کو کورس کی کسی بات کے معلوم کرنے کے لئے شرح کی ضرورت نہ ہو۔ جس پر بھروسہ کر لینے سے طلبا آپ کی تعلیم سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ وما علینا الا البلاغ

ناچیز
مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو زبان کی حقیقت

فارسی اور ترکی زبان میں اردو لشکر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ زبان لشکری اور حضوری و ایستادگان پایۂ تخت شاہی کی زبان پر جاری ہوئی اس لئے اس زبان کا نام اردو ہو گیا۔ اور نظم اردو کو ریختہ اس لئے کہتے ہیں کہ معماروں کی اصطلاح میں ریختہ اس مصالحہ کو کہتے ہیں جس کو در و دیوار کے استحکام کے لئے چند اجزا مخلوط کر کے بناتے ہیں اور چونکہ زبان اردو کی نظم میں بھی الفاظ عربی مثل اللہ رسول۔ و فارسی مثل دل۔ و زبان ترکی مثل چاقو [illegible]۔ و عبرانی مثل یوسف و ہارون۔ و یونانی مثل کیمیا و قرطاس۔ و [illegible] مثل [illegible] و [illegible]۔ و سنسکرت مثل [illegible] [illegible] و زبان تامل مثل [illegible] بمعنی ماش۔ و زبان تلنگو مثل [illegible] جو گیہوں و ماش وغیرہ چیزوں سے کھانے کے لئے بناتے ہیں۔ و زبان گجرات مثل [illegible] بمعنی شیرہ۔ و زبان [illegible] مثل [illegible]۔ و زبان [illegible] مثل [illegible] و زبان امریکا مثل تمباکو کی ترکیب ہے اس لئے اس کا نام ریختہ رکھا گیا ہے۔

زبانِ اُردو روز مرّہ شہرِ دہلی کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں اس سے پہلے برج بھاشا کا رواج تھا اسی زبان میں ہر شخص بات چیت کرتا تھا جب [illegible] ہجری میں سلطان شہاب الدین غوری نے ملک ہند پر چڑھائی کی۔ اہلِ ہند کو شکست دی۔ پتھورا کا کام تمام کیا۔ تمام ملک ہند سلاطین غور کے قبضۂ اقتدار میں آیا۔ رفتہ رفتہ زبانِ قدیم میں لفظ فارسی عربی۔ ترکی ملتا گیا۔ اس عہد میں حضرت امیر خسرو دہلوی نے بہت سے اشعار فارسی ہندی آمیز کہے ہیں۔

جب محمد شاہ ابن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے ظلم و ستم میں اُنکا شہرہ ہوا۔ باشندگانِ دہلی پہ ایک تازہ ظلم کیا کہ انکو شہر میں رہنے نہ دیا۔ دیوگیر معروف بہ دولت آباد میں بھیجدیا۔ اور پھر انہی سلطنت کے زوال سے پہلے اُنکو شہر دہلی میں بلوایا اس نقل و حرکت کے باعث بہت سے الفاظ دکھنی بھی زبان دہلی میں مل گئے۔ زبان میں ایک نقص پیدا ہوا۔ اور وہی انداز گفتگو آخر عہد جہانگیر شاہ تک رہا۔

جب شاہ جہاں بادشاہ نے [illegible] ہجری میں شاہجہاں آباد کو آباد کیا اور شہر قدیم کہ پہلو سے اندرپت میں تھا معطل ہوکر ملقب بشہر کہنہ و قلعۂ کہنہ ہوا شاہجہاں آباد میں اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ آکر مجتمع ہوئے قدیم ہندی متروک ہونے لگی۔ محاورے میں فرق آنے لگا۔ زبان اُردو کی ترقی شروع ہوئی پھر بھی

دکھنی لفظوں کا استعمال رہا کیا۔ اسکا سبب یہ تھا کہ جو لوگ سلاطین
کے ہمرکاب ممالک دکن کو جاتے تھے۔ شعراے دکن کے اشعار لاتے
تھے اور وہ اشعار مطبوع طبع باشندگان شاہجہاں آباد ہوتے تھے۔ اسی
طرح الفاظ دکھنی رواج پاتے تھے۔ اس عہد میں دکن میں احسن۔ احمد
اشرف۔ جعفر سالک سعدی فضلی لطفی محمود ہاشم باقی وغیرہ بہت سے
شعرا موجود تھے مگر ان سبھوں میں محمد ولی ولی سرآمد اقران و
امثال تھا بلکہ اپنے عہد میں شعرگوئی میں بےمثال تھا۔ اسکے شعر میں
نوعی غزلیت بھی ہے اور دوسروں کے بہ نسبت اسکے کلام میں فصاحت
و بلاغت بھی ہے۔ اشعار ولی

مرا دل مجھسے کرکے بے وفائی ۔۔۔ پسند خاطر خوباں ہوا ہے
سن ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق ۔۔۔ کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے
اک دل نہیں آرزو سے خالی ۔۔۔ ہرجا ہے محال اگر خلا ہے

یہ شخص عالمگیر کے آخر عہد میں اورنگ آباد سے دار الخلافت میں آیا تھا۔
اور اسی عہد سے شاہجہاں آباد میں اردو شعر کہنے کا رواج ہوا۔ اور بکثیر
صاحب علم اور موزوں طبعوں نے اس زبان میں شعر کہا ہے۔
محمد شاہ بادشاہ کے اوائل عہد یعنی سنہ ۱۱۳۲ ہجری میں جب دیوان
ولی دکن سے شاہجہاں آباد میں آیا اس کی شہرت ہوئی سبھوں نے
دیکھا اس وقت سے شعر ہندی کا رواج بہ نسبت سابق بہت زیادہ ہوگیا
اس عہد کے سخنوران تازی و نکتہ پروران گرامی میں نجم الدین آبرو۔
شرف الدین علی خان پیام شیخ ظہور الدین حاتم جعفر علی خان حشمتی۔
محمد شاکر ناجی ہیں لیکن ان سبھوں میں افصح شیخ ظہور الدین حاتم تھا

ان کے بہت سے شاگرد ہوئے۔ تو سب میں ممتاز مرزا رفیع سودا تھے۔ قصیدہ خوب کہتے ہیں۔ ان کے وقت تک محاورۂ قدیم کو کسی نے ترک نہیں کیا۔

مرزا مظہر جانِ جاناں نے زبانِ قدیم کی اصلاح کی اور بہ تتبّع زبانِ فارسی زبانِ ریختہ کو الفاظ غیر مانوس سے خالی کیا۔ اور ترکیب خوب و بندش مرغوب سے نیا جلوہ دکھلایا۔ اور خواجہ میر درد۔ اور میر محمد تقی میر اور مرزا سودا نے بھی قدرے آرائش و پیرائش دیگر زبانِ قدیم میں وہ تصرف کیا کہ ایک طرزِ جدید پیدا ہوا۔ اور اسی زبان میں جرأت مصحفی۔ انشا۔ میر حسن نصیر دہلوی وغیرہ شعرائے دہلی و لکھنؤ شعر کہتے رہے۔ انھیں دنوں میں الفاظ لاطینی مثل کپتان۔ و پرتگیزی مثل نیلام و کمرا۔ پاؤ لینی نان پاؤ۔ و الفاظ فرانسیسی مثل فرامین۔ و الفاظ انگریزی مثل گلاس کاگ وغیرہ بھی زبان اردو میں داخل ہو گئے۔

جب زمانہ حکیم مومن خاں مومن۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش کا آیا ان لوگوں نے زبان اردو کے روز مرّہ کو خوب صاف کیا اور فصاحت و بلاغت سے بھر دیا اور بہت سے غیر فصیح الفاظ کو استعمال سے خارج کر کے اس زبان کا رتبہ ایسا بڑھا دیا کہ اشعار اردو کو اشعار فارسی کے ہم پہلو کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس عہد میں دہلی کے بہت سے متروک الفاظ و ترکیب کو شعرائے لکھنؤ نے جائز رکھا۔ اور بہت سے الفاظ و ترکیب کو جو شعرائے دہلی کے نزدیک درست تھے شعرائے لکھنؤ نے ترک کر دیا۔

محمد شاہ کے زمانے سے پہلے نثر اردو کا رواج نہ تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں
فضلی تخلص ایک بزرگ نے دہ مجلس لکھی غالباً نثر اردو کی یہی پہلی
تصنیف ہے اس کے بعد مرزا رفیع سودا نے میر محمد تقی میر کی مثنوی
شعلۂ عشق کو نثر میں لکھا ہے۔ اس کے بعد میر محمد عطا حسین خاں
تحسین نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھکر نوطرز مرصع نام رکھا۔
یہ کتاب شجاع الدولہ کے عہد میں شروع ہوئی اور نواب آصف الدولہ
کے عہد میں ۱۲۱۳ھ میں ختم ہوئی۔

انگریزی عہد میں ۱۲۱۷ھ میں میر شیر علی افسوس نے باغ اردو
اور ۱۲۲۰ھ میں آرایش محفل لکھی۔ اور میر امن دہلوی نے اُسی
زمانے میں باغ و بہار آراستہ کیا۔ اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ۱۲۲۲ھ
میں مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ بعد اسکے
مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی
فہمایش کیلئے لکھے۔

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو میں ہونے شروع ہوئے
چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہوگئی۔ اسی سنہ میں
اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دہلی میں
جاری ہوا جس کے اڈیٹر مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی
محمد باقر دہلوی تھے۔

جب گورنمنٹ انگلشیہ نے دیکھا کہ اردو روز افزوں ترقی کر رہی
ہے تو یہ مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انھیں کی زبان
میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں چنانچہ ۱۸۴۳ء سے دہلی

ٹنس سوسائٹی قائم رکھکر ترجمے ہونے لگے۔ اُسی وقت سے اِس زبان کو بیحد ترقی ہوئی۔

سوالات

۱۔ اُردو کے معنی اور اس زبان کی وجہ تسمیہ بیان کرو۔؟

۲۔ نظم اُردو کو ریختہ کہنے کا کیا سبب ہے۔؟

۳۔ اُردو زبان میں کن کن زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں بذریعۂ امثال تحریر کرو؟

۴۔ زبان اُردو کہاں کی زبان ہے۔ یہ کب سے رواج پذیر ہوئی۔؟

۵۔ دکھنی الفاظ اُردو میں کیوں شامل ہوئے۔؟

۶۔ دہلی میں جب اُردو کی ترقی ہوئی تب دکھنی الفاظ اس میں قائم رہجانے کی کیا وجہ ہے۔؟

۷۔ دکھن کے قدیم اُردو شعرا کے چند تخلص بتاؤ اور اُن میں سے ولی کے مصنف اشعار بھی تحریر کرو اور اس کی سوانح عمری بیان کرو۔؟

۸۔ محاورات قدیم اُردو میں کس زمانے تک قائم رہے۔؟

۹۔ میرزا سودا نے اُردو میں کیا جدت کی؟

۱۰۔ یورپ کی زبانوں کے الفاظ کس زمانے میں اُردو میں داخل ہوئے۔؟

۱۱۔ کس زمانے میں کن کن شعرا نے اُردو میں فارسی کی طرح فصاحت و بلاغت پیدا کردی؟

۱۲۔ نثر اُردو کا رواج کب سے شروع ہوا اور سب سے پہلے نثر کتاب کونسی تصنیف ہوئی؟

۱۳۔ باغ اُردو اور آرایش محفل اور باغ و بہار و ترجمہ اخلاق محسنی قرآن مجید کا ترجمہ کن کن لوگوں نے کیا ہے۔؟

۱۴۔ دفاتر سرکاری کب سے اُردو میں ہوگئے۔؟

۱۵۔ سوسائٹی و ترجمہ کب اور کہاں اور کیوں قائم ہوئی۔؟

تربیت اطفال

اگر ہم اِس بات پر خیال کریں کہ انسانوں کے عیوب مثل کانٹے

بادلوں کے جمع ہوکر ہم پر برستے ہیں تو دنیا سے انسانوں کے بہت بہت ہی کم ہو جائیں۔ اور اگر ہم مرے ہوئے لوگوں کی آوازوں پر کان دھریں اور سمجھیں کہ وہ قبروں میں پڑے ہوئے زبانِ حال سے کیا کہہ رہے ہیں تو شاید ایک بھی برائی دنیا میں نہ رہے۔ مگر افسوس کہ ہماری آنکھیں اندھی اور ہمارے کان بہرے ہیں۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گذر جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں۔

یہ بات جو ہم نے کہی ٹھیک ٹھیک انسان کی طفولیت کی حالت سے نہایت ہی مناسبت رکھتی ہے اس لئے جو عمر اور وقت تربیت کا ہے جب وہ گذر جاتا ہے تو بجز لاعلاج رنج رہجانے کے اور کچھ نہیں ہوتا اور پھر انکا نا تربیت یافتہ رہنا مثل کالی گھٹا کے بھیر کراتا ہے اور بھیر برستا ہے اور کسی کے گھر کو بہا دیتا ہے اور کسی کے خاندان کو جلا دیتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزوں میں قدرتی تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور بجز انسان کے ایسی اور کوئی چیز نہیں ہے جس کو اس تبادلہ میں کچھ دخل ہو۔ اگرچہ انسان کو کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے مگر اس میں اتنی قدرت ہے کہ بہت سے چیزوں کو اپنے اختیار اور قابو

نہیں کرکے اُس قدرتی تبادلے میں شریک ہو۔ انسان ہی ایک ایسا وجود
ہے جو تھوڑا بہت کارخانہ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا
ہے وہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے کہ دنیا کی آیندہ کی
رفتار کو روک سکتا ہے یا ترقی کرسکتا ہے یا ابتر خراب حالت میں
ڈال سکتا ہے۔

یہ اقتدار ہمیں نا کامل اور خالص وجود کا جیسا کہ لڑکوں کی تربیت
یا نا تربیت رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اور ایسا کسی چیز سے ظاہر نہیں
ہوتا۔ جبکہ ہم لڑکوں کی حالت پر غور کرتے ہیں۔ اور اُن کی بھولی
بھولی اور سیدھی سادی طبیعتوں کو ہر ایک قسم کے گناہ سے
پاک پاتے ہیں اور ہر قسم کی تربیت کی استعداد ان میں دیکھتے ہیں
تو ہمکو خدا کی قدرت کا کامل نمونہ دکھائی دیتا ہے اور یقین ہوتا ہے
کہ وہ اُس ذات کامل کی دلی بخشش کی ہوئی چیزیں ہیں اس کے
بعد وہ ایک زمانے تک ہمارے ساتھ رہتی ہیں ہمارے سامنے اُنکی
عقل اور فہم کی ترقی ہوتی ہے اور ہماری تعلیم و تربیت اُن میں اثر
کرتی ہے اور یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے اُن میں عمدہ عمدہ
عادتیں اور خصلتیں بیٹھ جاتی ہیں اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے
سے شروع ہی سے اُن میں بد عادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی
ہیں پھر لڑکپن کا موسم نکل جاتا ہے اور جو کچھ لڑکوں نے ہماری
صحبت اور تربیت سے نیک یا بد حاصل کیا ہو اُس کا اثر دنیا میں
رہ جاتا ہے۔

لڑکپن کے زمانے میں جو عمر کہ سات برس سے پندرہ برس تک

ہے وہی ایسا زمانۂ زندگی ہے جس میں آیندہ کی بہبودی کے لئے
زیادہ تر کوشش ہوسکتی ہے اُس زمانے میں لڑکوں کا دل ہر چیز
کا متلاشی رہتا ہے حافظہ تیز ہوتا ہے قوتِ غور مضبوط ہوتی ہے
اچھی عادتوں کا دیکھنا اور عمدہ عمدہ نظیروں سے تربیت پانا جس کو
عموماً نیک صحبت کہتے ہیں۔ نہایت ہی مؤثر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ لڑکوں کے
لئے ذہنی و عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت
کی تعلیم کو دل نہایت جلد قبول کرتا ہے اور اُس کے تخم کو جس میں
آیندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہونگے بہت جلد اُگا دیتا
ہے لیکن اگر اس زمانے میں تربیت نہیں ہوتی تو پھر بہت ہی کم
فائدہ ہوتا ہے کیوں کہ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں عادت میں
مضبوطی آتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخرکار عادت طبیعت سے مل جاتی
ہے اور طبیعت ثانی کہلاتی ہے جسکا بدلنا نہایت ہی دشوار ہوتا ہے
ایک نہایت لائق شخص کا حکیمانہ قول ہے کہ "لڑکپن کی طبیعت
کتنی بڑی اہم امر ہے کہ آیندہ کی بھلائی یا برائی اُس کے احتیاط
وعدم احتیاط پر منحصر ہے جو لڑکوں کے مربیوں کی طرف سے ہوتی ہے
پس جو لوگ قومی ترقی کے خواہاں ہیں اُنکا سب سے بڑا کام یہی
ہے کہ لڑکوں کی تربیت کے لئے عمدہ انتظام کریں جس سے ہمکو
آیندہ کی بہبودی کی توقع ہے ورنہ ہمپر یہی مثل صادق آویگی کہ
یہاں کہیں لونڈے ملونڈے بھی پڑھے ہیں۔ (سر سید)

سوالات

۱۔ دنیا سے انسانوں کے عیوب کیونکر بہت ہی کم ہوسکتے ہیں؟ اور کیونکر برائی دنیا سے

یک قلم موقوف ہوسکتی ہے۔؟

۲۔ موجودہ وقت کو غنیمت جاننے کا کیا نتیجہ ہے؟

۳۔ تربیت کا وقت گذر جانے سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں۔؟

۴۔ ثابت کرو کہ انسان ایسا وجود ہے جو تھوڑا بہت کارخانۂ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا ہے۔؟

۵۔ لڑکوں کی عمر کا وہ کونسا زمانہ ہے جس پر آیندہ کی بہتری اور بہبودی کا انحصار ہے اور کیوں۔؟

۶۔ لڑکوں کی تربیت کے لیئے عمدہ انتظام کون لوگ کرتے ہیں اور اسکا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

تعلیم

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے جیسے سنگ مرمر کے پہاڑ کے مانند ہے کہ جبتک سنگتراش اُس میں ہاتھ نہیں لگاتا اُسکا دھندلا اور کھردرا پن دُور نہیں کرتا۔ اُس کو تراش خراش کر سڈول نہیں بناتا وس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا اُس وقت تک اُسکے جواہر اُسی میں چھپے رہتے ہیں اور اُس کی خوشنما سین اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اُس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اُسوقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اُس میں چھپی ہوئی ہیں اور بغیر جس قسم کے مدد کے نمود نہیں ہوسکتیں ظاہر نہیں ہوتیں ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ جو ہنی مورت ایک

پتھر کے ڈھوکے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اس میں سے گھڑ دیتا ہے۔ مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا ہے۔ جو نسبت صورت گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوکے سے ہے وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم۔ ولی۔ و ابدال۔ نیک و عقلمند بہادر و نامور۔ ایک گنوار آدمی کی صورت میں چھپے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں جب میں جاہل اور وحشی قوموں کے حالات پڑھتا ہوں تو ان نیکیوں سے جو ان میں ہیں مگر ناشایستہ اور اس دلیری اور جرأت سے جو ان میں ہے مگر خوفناک اور اس استقلال سے جو ان میں ہے مگر بے ڈھنگا اور اس دانائی اور عقلمندی سے جو ان میں ہے۔ مگر جانوروں کے سے مکر و فریب سے ملی ہوئی اور اس صبر و قناعت سے جو ان میں ہے۔ اور گویا نا امیدیاں ہی ان کی امیدیں ہیں نہایت خوش ہوتا ہوں سچ ہے کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں اور جس قدر کم و بیش عقل کی ہدایت انکو ہوتی ہے اور جس قدر کہ عقل ان جوشوں کو درست کرتی ہے اسی قدر مختلف طور پر ویسے کام ہوتے ہیں۔ امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب ہم یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر یا ایک کام پر سے چھڑا کر دوسرے کام میں لگانے پر جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دیدیتے ہیں یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلکر ستی ہو جاتی ہے تو کون شخص ہے

جو اُن کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کریگا گو کہ کیسے ہی ناشایستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس قسم کے جاہل اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ گو وہ وحشی پنے ہی کی حالت میں کیوں نہوں۔ لیکن اگر اُن کی مناسب طور سے اور عمدہ طور سے درستی کیجاوے تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پاسکتی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شایستہ نیکیاں اُن سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ (سرسیدؒ)

سوالات

۱۔ مصنف نے انسان کی رُوح کو پتھر سے سنگ مرمر کے مشابہ بیان کرکے اُسکے متعلق کیا ذکر کیا ہے؟

۲۔ ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسّم مورتوں کے بننے کی تشبیہ میں نہایت خوبصورتی سے کس طرح بیان کیا ہے۔؟

۳۔ امریکہ کے حبشی غلاموں کی عجیب باتیں کیا کیا سُننے میں آئی ہیں۔؟

۴۔ وحشیانہ نیکیاں کیونکر ترقی پاسکتی ہیں۔؟

تعلیم کی ضرورت

رعایا گورنمنٹ کی دولت ہے۔ اس کی رضامندی گورنمنٹ کی قوت۔ رعایا اور گورنمنٹ کے ہوغرض ایسے باہمدگر وابستہ ہیں کہ اگر رعایا اچھی رعایا ہو اور گورنمنٹ گڈ گورنمنٹ۔ تو رعایا ہی گورنمنٹ ہے۔ اور گورنمنٹ ہی رعایا۔ مگر افسوس بڑے افسوس۔ بڑے سخت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بدنصیب ہندوستان کی رعایا اور

گورنمنٹ میں وہ گاڑھا اتحاد نہیں ہے۔ اور اُس کے ہونے میں ابھی بہت دیر معلوم ہوتی ہے جسکا ہونا رعایا اور گورنمنٹ دونوں کے حق میں مفید بلکہ ضروری ہے۔

برٹش گورنمنٹ کو ہندوستان میں حکومت کرتے ہوئے قرن ہو گئے بھلا پھر کونسی چیز رعایا اور گورنمنٹ میں اتحاد پیدا ہونے کی مانع ہے۔ کیا گورنمنٹ جابر اور سخت گیر ہے۔ توبہ توبہ۔ ماں باپ سے بڑھکر شفیق۔ تو کیا رعایا سرکش ہے۔ نہیں نہیں۔ ایسی منقاد۔ اس قدر مطیع کہ ایک چرواہے کو بھیڑ بکری کے ریوڑ کا روکنا مشکل اور ایک ننھے کانسٹبل کو انبوہ رعایا کا سنبھالنا آسان۔ پھر کسکا قصور ہے۔ رعایا کا۔ کیونکہ نا تعلیم یافتہ ہیں۔ انکو گورنمنٹ کا منشا معلوم نہیں۔ گورنمنٹ کے اصول سے آگاہی نہیں۔ باپ دادا سے انھوں نے دیکھی ہیں شخصی خود مختار حکومتیں۔ اُن کے ذہنوں میں متوارث طور پر یہہ بات مرتکز ہو رہی ہے کہ سلطنت اسی واسطے موضوع ہوئی ہے کہ حاکم وقت کی آسایش کے لئے رعایا مصیبت اٹھائے۔ رعایا کمائے حاکم اڑائے۔ رعایا اپنی انتڑیوں کو سوسے تاکہ بادشاہ کے نوکروں کے چاکروں کے پشکاروں کو تحفہ ہو۔ رعایا جاڑے میں سکڑے۔ تاکہ شاہی اصطبل کے ٹٹو کشمیری شالوں کی گردنیاں اوڑھیں

پس اے حاضرین! انجمن میں آپ صاحبوں کو صمیم قلب سے مبارکباد دیتا ہوں آپ نے زمانے کی ضرورت کو خوب سمجھا۔ کوئی شخص جسکو عقل سے ذرا بھی بہرہ ملا ہے اِس سے انکار نہیں کر سکتا کہ تعلیم ہی رعایاے ہند کو شایستہ اور مہذب بنائیگی۔ تعلیم ہی انکو

دولت کی کیمیا سکھائیگی۔ تعلیم ہی ان کی نظر میں برٹش گورنمنٹ کی قدر بڑھائیگی۔ تعلیم ہی انکو برٹش گورنمنٹ کی برکتوں سے متمتع ہونیکی حرص دلائیگی۔ تعلیم ہی بدگمان رعایا اور رُکی ہوئی گورنمنٹ کے دلوں میں صفائی کرائیگی۔ اور جب وہ زمانہ آئیگا کہ رعایا اور گورنمنٹ ایک جان دو قالب ہونگے۔ تو ہندوستان کو جنّت نشان کہنا حقیقتاً ہوگا نہ ایشیائی شاعری کا مبالغہ۔ اُسوقت ہندوستان کی سلطنت پوری پوری مطمئن سلطنت ہوگی مستحکم۔ بیرونی دشمنوں سے بے خطر اور اندرونی فسادات مخاصم ناروا سے فارغ۔

(نذیر احمد دہلوی)

سوالات

۱۔ رعایا اور گورنمنٹ دونوں کے حق میں مفید بلکہ ضروری کیا چیز ہے۔؟

۲۔ تعلیم کا اثر ہندستان پر کیا پڑیگا۔؟

تعلیم مروجہ میں کس چیز کی کسر ہے

اب مَیں اپنے خیال کے مطابق یہ بات دکھانا چاہتا ہوں کہ تعلیم مروجّہ میں کس چیز کی کسر ہے۔ اِس میں اتنی ہی کسر ہے کہ ادھوری اور نا تمام ہے۔ میں اُسوقت کے تعلیم یافتوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اِنکو ہر طرح کی تحسین اور توقیر کا مستحق جانتا ہوں اور ہر چند ساری عمر میں نے بھی یہی پاپڑ بیلے ہیں۔ مگر میں صاف دل سے اُنکو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہوں۔ میری طالب علمی کے زمانے میں تو بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے۔ کے کچھ بکھیڑے تھے نہیں۔ اور خدا

لے مجکو اس دردسری سے بچایا ہے کہ اپنے نام کے ساتھ کسی خطاب کا
دم چھلا لگاؤں۔ لیکن میں اسکا معترف ہوں کہ اگر مجھ سے ایسے
ایسے کڑے امتحان لئے گئے ہوتے تو میں ضرور فیل (ناکامیاب) ہوتا۔
ہاں تو غرض یہ ہے کہ مجکو تعلیم مروجہ کے نقصان دکھانے منظور
ہیں۔ تعلیم یافتوں کی اہانت مقصود نہیں۔ تو کوئی تعلیم یافتہ اس سے
برا نہ مانے کہ میں تو آجکل کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ کو بھی اس مثل
کا مصداق سمجھتا ہوں (جیک آف آل اینڈ ماسٹر آف نن) سب
کچھ جانتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ ان کے دل کا حال قریب
قریب اس کے معدے کا سا ہے۔ اگر کوئی شخص اوپر تلے اناپ
شناپ کھانا ٹھونستا چلا جائے تو نہ معدہ اس کے ہضم پر قادر
ہوگا۔ اور نہ تغذیہ بدن کریگا۔ اسی طرح اگر کوئی طالب علم پڑھنے
میں طوطے کی طرح حفظ کرتا جائے (جیساکہ آجکل ہو رہا ہے) تو یقیناً
وہ اسکو ہضم نہیں کرسکے گا۔ اور نہیں کرسکتے۔ اور نہ ایسا پڑھنا
اس کے لئے مفید ہوگا۔ اور نہیں ہوتا۔ کسی کا اچھا مقولہ کبھی کا
نظر سے گذرا ہوا یاد ہے کہ ہر چیز میں تھوڑا تھوڑا اور کوئی چیز
ساری بھی۔

پس مجھسے پوچھتے ہو تو تعلیم میں اس قاعدے کی حرفاً حرفاً
تعمیل ہونی چاہئے۔ طریقہ مروجہ میں ہر چیز میں سے تھوڑا تھوڑا کا
نباہ تو خوب کیا جاتا ہے مگر کوئی چیز ساری بھی کا مطلق خیال
نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس طریقے کے مطابق جتنے لوگوں نے
تعلیم پائی ان میں کوئی شخص کسی شعبے کا کامل فن نہو احسن طرح

مثلاً درخت ثمر کی رسیدگی کا ایک وقت ہوتا ہے کہ اس سے
پہلے اس میں پھل نہیں آتا۔ اسی طرح درخت علم کو جبتک کمال رسیدگی
نہیں ہوتی۔ اور نہ اس سے کسی فائدے کی امید کیجا سکتی ہے علم شے
بہ از جہل شے کے امتیاز سے دیکھو تو اوسط سے ادنے درجے کی تعلیم
بھی خالی از منفعت نہیں۔ مثلاً گروہ کاشتکاران اگر اتنا لکھنا
پڑھنا اور لکھا کرنا سیکھ لیں کہ پٹواری مغالطہ دہی اور زمیندار
زیادہ ستانی نہ کرسکے تو اس سے کسکو انکار ہے کہ اتنی سی استعداد
علمی کاشتکار کے لیئے مفید ہوگی۔ اور کون کہتا ہے کہ کاشتکاروں کو
اس قدر تعلیم جسکے وہ سخت حاجتمند ہیں نہ دیجائے۔ لیکن گفتگو
اس میں ہے کہ اگر ہندوستان کو یورپ کی طرح ترقی دینا منظور
ہے تو آیا ویسی ترقی اور ویسی کا کیا ذکر ہے اس کی آدھی پاؤ
بھی اس تعلیم کے ذریعہ سے ہوسکے گی یا نہیں۔؟
مجھکو اسکا کامل یقین ہے کہ جب تک علوم جدیدہ کے ہر شعبے
کے کامل فن تیار ہونگے ہندوستان حقیقی نکبت سے ایک انچ
کی قدر بھی تو اوپر کو نہیں اٹھ سکتا۔ اور جب ہمارے طالب علم
کامل فن کی لذتوں سے آشنا ہونگے تو سمجھیں گے۔ نوکری کتنی ہی
بڑی کیوں نہو خسیس ترین منفعت ہے۔ جس کی ایک کامل فن
توقع کرسکتا ہے۔ جو لوگ اسوقت علوم جدیدہ کے حاصل کرنے میں
مصروف ہیں ان کے بزرگ۔ ان کے خیر خواہ۔ ان کے استاد۔ ان کے
مستحق بہتیری نصیحتیں انکو کرتے ہونگے۔ میں ایک اجنبی آدمی
ہوں۔ نہ کچھ غرض نہ مطلب حسبۃً للہ ایک نصیحت میں بھی

کئے دیتا ہوں۔ یاد رکھوگے تو یاد کروگے۔

کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی — کس بے کمال بہیچ نیرزد عزیزِ من

تعلیم مروجہ کا ایک نقصان اور سنو وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی طبیعتیں خلقتاً پرانی باتوں پر قائم رہنے والی واقع ہوئی ہیں یہ نقال ہیں نہ موجد۔ نواحِ دہلی میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار برس پہلے کی عمارتیں موجود ہیں ان پر چھکڑوں اور ہلوں کی تصویریں بنی ہیں وہ سارے کے چھکڑوں اور ہلوں سے اس قدر مشابہ ہیں کہ گویا ان ہی کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ باوجودیکہ چھکڑا اور ہل روز مرہ کی ضرورت کی چیزیں ہیں مگر کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا کہ ان میں ایک کیل یا ایک کانٹا گھٹاتا یا بڑھاتا۔ پس جدول قسمت سے ہرگز توقع نہیں کہ ہندوستانی آپ کچھ کر لیں یہ تو اپنے احدی بیٹھے ہیں کہ لاؤ ورو و نوالہ دو لاؤ لے دو ساتھ کر دو تب کہیں جگہ سے ہلیں تو ہلیں۔ (نذیر احمد دہلوی)

سوالات

۱۔ مصنف نے بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے کے متعلق اپنے خیالات کیا ظاہر کئے ہیں؟

۲۔ تعلیم مروجہ کی نسبت مصنف کی کیا رائے ہے۔؟

۳۔ تعلیم کیسی ہونی چاہئے اور انسان کو کیا سیکھنا چاہئے۔؟

۴۔ استاد کس قسم کے درکار ہیں اور کیوں۔؟

۵۔ نقال اور موجد میں کیا فرق ہے۔ اور مصنف نے اہل ہند کے لئے ان میں سے کونسا لقب تجویز کیا ہے اور کیوں۔؟

محنت

انسان کے چال چلن کی تربیت کے واسطے محنت ایک جزو اعظم ہے۔ کیونکہ اس سے اطاعت۔ بُرد باری مستعدی توجہ اور ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے خاص کاروبار میں واقفیت و قابلیت اور لوازمات زندگی کے سر انجام میں لیاقت و مشّاقی حاصل ہوتی ہے۔

مشغلہ ہماری ہستی کے لئے ایک لازمی امر ہے۔ جس کی پابندی سے ہم کسی طرح چھوٹ نہیں سکتے۔ اگرچہ بہت سے لوگ اوقات بسری کے واسطے بامر اجباری اپنے ہاتھوں سے مشقت کرنی گوارا کرتے ہیں لیکن دنیا میں جو لوگ قانونِ قدرت کے مطابق زندگی سے متمتع ہونا چاہتے ہیں انھیں کسی نہ کسی طرح کی محنت ضرور کرنی چاہیے۔

محنت اگرچہ ایک قسم کا بوجھ اور جبر ہے۔ لیکن یہی عزت اور شہرت کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر کسی امر کا تکمیل پانا بالکل غیر ممکن ہے انسان کو جو اعزاز حاصل ہوتا ہے وہ صرف محنت کے باعث ہوتا ہے اور یہ ایک درخت ہے جس کے پھل کا نام تہذیب ہے۔ پس اگر دنیا سے محنت کا نام مٹا دیا جائے تو بنی آدم میں سے اخلاقی صفت بالکل زائل ہو جائے۔ کاہلی کے کارن انسان کو طوقِ لعنت اپنے گلے میں پہننا پڑتا ہے اور یہ اس طرح آدمی کو خاک میں ملا دیتی ہے اور بیکار کر دیتی ہے جس طرح لوہے کو مورچہ خراب کر دیتا ہے۔

جب سکندر نے فارس کو فتح کیا تو وہاں کے باشندوں کے طور طریقے دیکھ کر یہ تجربہ حاصل کیا کہ وہ لوگ اس امر سے بالکل واقف

نہیں ہیں کہ لہو و لعب میں زندگی بسر کرنی بدترین حالت ہے۔ اور محنت و مشقت میں اوقات گزاری عمدہ ترین زندگی ہے۔

شہنشاہ روس نے بستر موت پر اپنے سپاہیوں کو صرف یہی وصیت کی تھی کہ تم لوگ ہمیشہ محنت کے عادی رہنا۔ اور یہ محض لگاتار محنت کا سبب تھا کہ سرداران روم نے اپنی قوت و حکومت کو بہت کچھ وسیع کر لیا تھا۔

کسی شخص نے ایک دانشمند سیاح سے سوال کیا کہ آپ نے دنیا میں کسی ایسی چیز کا بھی تجربہ کیا ہے جسے ہر خاص و عام پسند کرتا ہو۔ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں وہ کاہلی ہے جسے ہر کس و ناکس عزیز رکھتا ہے۔ انسان میں اس امر کی کوشش کی یہ قدرتی تحریک ہوتی ہے کہ اس کو بلا دقت و محنت فوائد حاصل ہوں۔

آرام طلبی سے جس طرح شخصی نقصان ہوتا ہے اسی طرح قومی مضرت بھی متصور ہے۔ کاہلی سے دنیا میں کوئی کام ہوا ہے اور اور نہ ہوگا۔ آرام طلبی سے دنیا میں ہمیشہ نقصان ہوا ہے اور ہوگا۔ قدرت کا منشاء یہ ہے کہ اس سے کسی امر میں کامیابی نہو۔ کاہلی جسم و دماغ کے واسطے بالکل زہر کی خاصیت رکھتی ہے۔ اس سے صدہا قسم کے نقصان ہوتے ہیں۔ یہی سارے عیبوں کی جڑ ہے جسمانی کاہلی کی نسبت دماغی کاہلی زیادہ تر مضرت رساں ہے۔ دماغ کو بیکار رکھنا ایک ایسی بیماری ہے جس سے روحانی کاہلی ہوتی ہے اور خود اس کی موجودگی ایک عذاب ہے۔ جس طرح آب بستہ میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح کاہل آدمی کے

دماغ میں قبیح و مذموم خیالات بھرے رہتے ہیں۔ جس کے باعث
روح سی لطیف شے ناپاک اور آلودہ ہوجاتی ہے۔

میں اِس بات کو نہایت دلیری سے کہتا ہوں کہ جو لوگ کاہل
ہیں چاہے اُنھیں دنیا کی نعمت ملا ہے لیکن وہ کبھی خوش اور
سیر نہیں ہونگے اُن کے دل کی سب تمنائیں بر آئیں کُل مرادیں
پوری ہوں۔ اور ہر طرح کا اطمینان حاصل ہو لیکن جب تک
وہ کاہل رہیں گے۔ اُس وقت تک اُن کو دماغی جسمانی ہر قسم
کی تکلیف محسوس ہوگی۔ ہمیشہ مجہول۔ افسردہ۔ پژمردہ۔ حزین
غمگین اور بے چین رہیں گے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان
کو کبھی بیکار اور کاہل نہیں ہونا چاہیے۔

سچی خوشیاں کاہلی سے کبھی نہیں حاصل ہوتیں۔ ہمیشہ محنت
اور مشغلے ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ آرام طلبی سے آدمی جس قدر
تھک جاتا ہے محنت سے اُس قدر نہیں تھکتا۔ کیونکہ اِس سے
تو روح کو فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ گو ہر وقت مشغول
رہنے سے دماغ کچھ ضعیف ہوجائے لیکن کاہلی سے یہ بالکل ضائع
و بیکار ہو جاتا ہے ایک دانشمند کا قول ہے کہ کوئی چیز ایسی
مسرت رساں نہیں ہے جیساکہ وقت کا فضول ضائع کرنا۔ اُسی کا مقولہ
ہے کہ انسان کا دل ایک چکّی کے مانند ہے جس میں گیہوں پیسا
جائے تو آٹا تیار ہو۔ اور خالی چلائی جائے تو خود اُس کا نقصان ہو۔

کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش کرنی اور پھر اُس کے
حصول میں جو دقتیں ہوتی ہیں اُنکو نہ برداشت کرنا نہایت پست

ہوتی ہے۔ اُس کو صاف لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ کوئی چیز بغیر قیمت کے نہیں مل سکتی اور تو اور فرصت کا وقت بھی عمدہ طور پر صرف نہیں ہو سکتا جب تک وہ کوشش سے حاصل نہ کیا جائے کیونکہ بغیر محنت کے حاصل کیا ہوا فرصت کا وقت ایک ایسی شے ہے جس کی قیمت نہیں دی گئی۔

فرصت کی قدر اسی وقت معلوم ہوگی جب محنت کیجائیگی کیونکہ محنت کے بغیر فضول بیٹھے رہنے سے طبیعت گھبرا اٹھیگی۔ پس ایسی فرصت سے کچھ تفریح نہیں ہوگی۔ کاہل خواہ دولتمند ہو اور خواہ غریب دونوں کی زندگی قابل نفرت ہے۔

فرانس میں ایک کاہل فقیر تھا۔ جس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ اور آٹھویں مرتبہ قیدخانے میں گیا تھا۔ اُس کے گندے پرچے پر الفاظ لکھے ہوئے تھے جنھیں کاہلوں کا مقولہ سمجھنا چاہیئے۔ "گزشتہ زمانہ سے مجھے دھوکا ہوا۔ موجودہ سے تکلیف ہے۔ اور آئندہ سے دہشت ہے" پس کاہل کی عمر کے تینوں زمانوں میں سے ایک بھی آرام و اطمینان کا زمانہ نہیں۔

محنت ہر طبقے اور ہر گروہ کے لوگوں کے واسطے لازمی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ امیر ہو خواہ غریب اپنی اپنی حالت کے مناسب الگ الگ کام اختیار کرے خاندانی اور تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ جو شخص دولتمند بھی ہو وہ تمام خلق خدا کے ساتھ نیکی کرنا اپنا فرض سمجھے۔ اپنا روپیہ اور وقت صرف کرکے لوگوں کو علم سکھلائے۔ شائستہ بنائے۔ ملک کو جہالت کی آفت سے بچاوے۔

ورنہ اپنے ذاتی آرام و آسایش سے کبھی کافی اطمینان نہیں ہوگا۔
کوئی ایماندار اور عالی دماغ آدمی فضول لہو و لعب میں مصروف رہنا کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ فضول اور بیکار بیٹھے رہنے سے نہ تو کوئی فائدہ ہوسکتا ہے اور نہ عزت۔ گو کوئی پست خیال کا آدمی اسپر قناعت کرے۔ لیکن جو شخص عالی دماغ۔ ایماندار اور مستعد ہے وہ کبھی اس حالت کو سچی عزت اور اصلی وقعت کے مقابل نہیں خیال کرسکتا۔

یہ تجربہ کار کا قول ہے کہ میں کبھی یقین نہیں کرسکتا کہ بیکار آدمی کو حقیقی خوشی حاصل ہوسکے۔ ہمارے کام ہماری طرز زندگی کے مطابق ہوتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کونسا کام کرسکتے ہو۔ پھر میں کہہ دونگا کہ تم کس قسم کے آدمی ہو۔ محنت کا شوق انسان کو خراب و ذلیل مذاق سے باز رکھتا ہے۔ دقتوں اور مشکلوں سے بچاتا ہے۔
لوگوں کا خیال ہے کہ تکلیفات اور مصائب سے نجات ہوسکتی ہے لیکن تجربے سے اس کے خلاف ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ محنت و مشقت انسان کے واسطے قدرت نے مقرر کردی ہے۔ جس قدر لوگ مشکلوں کے مقابلہ کرنے سے بھاگتے ہیں۔ اُسی قدر مشکلیں اُنکا پیچھا نہیں چھوڑتیں
کم سے کم ذاتی آسایش کے واسطے کسی عمدہ شغل میں مصروف رہنا بہت ضروری ہے جو لوگ محنت نہیں کرتے وہ اُس کے پھل سے مستفید نہیں ہوسکتے۔
ایک صاحب کا قول ہے کہ خواب راحت کے بعد جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو اُسی حالت میں محظوظ رہ سکتے ہیں کہ ہم کچھ کام

کریں۔ اور ہمیں اوقات فرصت اُسی حالت میں آسائش دینگے جب ہم محنت سے اپنے کام انجام دیں۔ اور فرائض پورے کریں۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اکثر لوگ حد سے زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جن کی موت کاہلی۔ نفس پرستی اور آرام طلبی کی حالت میں ہوتی ہے جو لوگ بے انتہا محنت کرنے سے مرجاتے ہیں اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو باقاعدہ بسر کرنا نہیں جانتے۔ اور جسمانی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے

یہ مقولہ ٹھیک ہے کہ کیسا ہی سخت اور مشکل کام ہو جب اصول و قواعد کے مطابق کیا جائیگا تو ممکن نہیں کہ اُس سے کچھ ضرر پہونچ سکے۔ عمر کی درازی امتحان زندگی کا صحیح پیمانہ نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی زندگی کا اس طرح اندازہ کرنا چاہئے کہ اُس نے اپنے خیالات میں کون سے کام کئے اور کس قسم کی واقفیت پیدا کی۔ بس دنیا میں ہوکر جس قدر جس شخص نے زیادہ کام کئے۔ واقفیت حاصل کی۔ خیالات ظاہر کئے۔ سمجھنا چاہئے کہ وہ حقیقت میں اُسی قدر زندہ رہا۔ کاہل اور فضول آدمی کی عمر کتنی زیادہ ہی کیوں نہو حقیقت میں بالکل نیست ہے۔

یہ بات نپولین کی عادت میں داخل تھی کہ جب وہ کوئی عمدہ دستکاری دیکھتا تو اُس کے موجد کی بہت عزت کرتا۔ کسی موقع پر وہ ایک شخص کے ساتھ سیر کر رہا تھا اتفاقاً چند مزدور بوجھ لئے ہوئے گذرے۔ اُس شخص نے غصے ہوکر مزدوروں کو ڈانٹا کہ اس طرف سے مت جاؤ۔ اسپر نپولین نے کہا کہ ان کے بوجھوں کی

عزت کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان بیچاروں کی محنت عام لوگوں کے فائدہ کے لیے ہے۔ عمدہ مشاغل کی عادت جس طرح مردوں کے واسطے باعث مسرت ہے اسی طرح عورتوں کی بھی فرحت کا سبب ہے۔ اس کے بغیر عورتیں بے پروائی اور بے شغلی کی خراب حالت میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ جسمانی عوارض بھی انہیں گھیر لیتے ہیں اور اعلے درجہ کی آسائش اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کام شوق اور محنت کے ساتھ کیا جائے۔ عمدہ مشاغل کی پابندی سے صرف جسمانی راحت نہیں ہوتی۔ بلکہ دماغی فرحت بھی حاصل ہوتی ہے۔ کاہل آدمی اپنی زندگی بالکل مجبورانہ طور پر بسر کرتا ہے اور اپنی خلقت کے بیش بہا جوہر کو اگرچہ قطعی طور پر نہیں معدوم کرتا لیکن خراب غفلت میں ضائع کر دیتا ہے۔ باقاعدہ آدمی ایک ایسا منبع ہے جس سے مختلف انعام کے عمدہ مشاغل نکلتے ہیں۔ اور جہاں تک اس سے ممکن ہوتا ہے سب کاموں میں مصروف ہوتا ہے۔ کسی قسم کی معمولی محنت یا مشقت کاہلی کے نسبت بہت اچھی ہے۔

محنت کی عادت کام کرنے کا قاعدہ بتاتی ہے۔ اور وقت کی پابندی سکھاتی ہے۔ پس جب اس طرح سے عمدہ مشغلوں میں وقت صرف کرنے کی عادت ہو جائیگی تو پھر آدمی اپنا ایک لمحہ بھی بیفائدہ ضائع نہ ہونے دیگا اور جب فرصت کا وقت آئیگا تو اس کی قدر و منزلت معلوم ہوگی۔ ایک صاحب کا قول بہت صحیح ہے کہ اگر کاہل آدمی کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ وقت کا خون کرتا ہے تو

باقاعدہ محنت کرنے والے کی نسبت یہ کہنا چاہیئے کہ وہ وقت میں جان ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے افعال اُس وقت بھی قائم و باقی رہیں گے۔ جب خود اُس کا نشان بھی نہ رہے گا۔

باقاعدہ کام کرنے والوں کی محنت کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ اُنھیں کاہلی بہت ناگوار گذرتی ہے۔ اور جب اپنے تمام کام سے فراغت حاصل کر لیتے ہیں تو اُنھیں دوسرے کام تلاش کرنے سے آسایش ہوتی ہے۔

محنتی آدمی اپنے اوقات فرصت کا مشغلہ بہت جلد تلاش کر لیتا ہے۔ اور اُسے ہر وقت فرصت حاصل کر لینے کا اختیار رہتا ہے لیکن برخلاف اس کے جو لوگ کاہل ہیں اُن کو کسی وقت فرصت نہیں ہوتی۔ ایک صاحب کا قول ہے کہ جو وقت کو استعمال نہیں کرتا اُسے کبھی فرصت نہیں رہتی۔ لیکن جو لوگ کام کرتے ہیں اور محنت کے عادی ہوتے ہیں وہ اپنی فرصت کے گھنٹوں میں بہت بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے لئے کسی کام میں مصروف رہنا به نسبت اس کے بہت اچھا ہے کہ وہ کاہلی اور سستی کی حالت میں پڑے رہیں۔ پس جب محنت کرنے والے آدمی کا دماغ اس کے روزانہ کام سے پریشان ہو جاتا ہے تو وہ اپنی تفریح طبع کے لئے طبعیات۔ نباتات وغیرہ کے سیکھنے اور دریافت میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن اس قسم کی تفریح طبع حاصل کرنے والے وہی لوگ ہیں جو وقت کے بہت بڑے محافظ اور دنیاوی ہوا و ہوس کے مخالف ہوتے ہیں۔

جس طرح آدمی کو جسمانی صحت قائم رکھنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے اسی طرح دماغی قوت درست رکھنے کے لئے بھی اس سے کام لینے کی حاجت ہے۔ محنت مضر نہیں۔ ہاں حد سے زیادہ محنت کرنی باعث نقصان و ضرر ہے۔ نا امیدی کے کام اور عاجز کردینے والے افعال مضرت رساں ہوتے ہیں۔ اور ہونہار کام فرحت بخش۔ اور جب یہ عمدگی اور خوش اسلوبی سے عمل میں لائے جاتے ہیں تو اُلٹے فرحت اور مسرت کے اسباب حاصل ہوجاتے ہیں۔

دماغی کام اگر اعتدال سے کیا جائے تو اُس سے بہ نسبت کسی اور کام کے کچھ بھی پریشانی نہیں ہوتی اور جب باقاعدہ عملدرآمد ہو تو اُس سے صحت جسمانی و تندرستی متصور ہے۔ صرف کھانا۔ پینا۔ سو رہنا۔ اور کاہلی میں زندگی بسر کرنا بہت بڑے مضرت اور نقصان کا باعث ہے۔ لیکن حد سے زیادہ محنت کرنا بھی بہت بُرا ہے۔ خاصکر اُس محنت سے بہت نقصان ہوتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے۔ کیونکہ محنت سے اس قدر تکلیف نہیں ہوتی جس قدر تھک جانے سے نقصان ہوتا ہے جس طرح بالو اور سنگریزوں کے بکثرت رگڑوں سے کسی کل کے پرزے خراب ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ماندگی سے جسم میں ضعف و نقاہت طاری ہو جاتی ہے۔ پس حد سے زیادہ محنت کرنے اور تھک جانے کی نہایت ہوشیاری سے نگہبانی کرنی چاہئے کیونکہ حد سے زیادہ دماغی محنت سخت مشکل کام ہے۔ اور یہ فعل قدرتی طور پر مُضر اور مُہلک ہے۔ جو شخص دماغ سے بافراط کام لیتا ہے اُس کے خیالات بھی اس طرح پریشان

اور خراب ہو جاتے ہیں جس طرح کوئی پہلوان اپنی طاقت سے زیادہ داؤ پیچ میں محنت کرکے اعضا و جوارح کو کمزور، شکستہ اور بیکار کر ڈالے۔ الغرض بغیر محنت و کوشش دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا اور نہ عزت و شہرت حاصل ہو سکتی ہے قدرت کا منشا ہے کہ انسان دنیا میں رہکر محنت و مشقت کرے۔ اپنے آرام و آسایش اور ناموری کے اسباب مہیا کرے۔ لیکن اُس کے حصول میں اُس وقت تک کامیابی بالکل غیر ممکن ہے جب تک کوشش و جانفشانی نہ کی جائے۔ محنت کے بعد اُس کا ثمرہ ملتا ہے۔ تکلیف کے بعد راحت کا مزہ معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ہے اُن کی سوانحعمری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بڑی محنت و جانکاہی کے بعد یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔ پس دنیا میں جن لوگوں کو یہ شوق ہے کہ عزت و ناموری حاصل کریں اُنھیں چاہیئے کہ جس قاعدے اور طریقے سے یہ ممکن الحصول ہے اُس سے گریز نہ کریں یعنی کاہل اور بیکار نہ بیٹھے رہیں بلکہ محنت و کوشش کی پابندی اپنے اوپر لازم اور فرض سمجھیں۔ ۵

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا سَو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

(مولوی سید مرتضیٰ از رسالہ تدبیر)

سوالات

۱۔ محنت انسان کی کس چیز کے لیے ضروری ہے اور اُس سے کیا کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں

۲۔ ثابت کرو کہ مشقت اور محنت انسان کے لیے ضروری امر ہے۔

۳۔ انسان کو شہرت اور اعزاز حاصل کرنے کے کیا وسائل ہیں۔؟

۴- محنت نہ کرنے کے نتائج تحریر کرو۔؟
۵- سکندر نے فتح فارس کے بعد وہاں کے باشندوں کے حالات دیکھکر کیا سبق حاصل کیا تھا؟
۶- شہنشاہ روس نے بستر مرگ پر اپنے سپاہیوں کو کیا وصیت کی تھی۔؟
۷- کاہلی کے متعلق ایک سیاح سے ایک شخص نے کیا سوال کیا تھا اور اسکا جواب کیا تھا؟
۸- آرام طلبی اور کاہلی کے نقصانات بیان کرو۔؟
۹- وقت کے ضائع کرنے کی بابت ایک دانشمند کا کیا مقولہ ہے۔؟
۱۰- ثابت کرو کہ کسی چیز کی حاصل کرنے میں جو وقت آ پڑے اسکا برداشت کرنا ضروری ہے؟
۱۱- فرصت کی قدر کب ہوتی ہے۔؟
۱۲- کاہلی کی زندگی کیوں قابل نفرت ہے۔؟
۱۳- محنت ہر گروہ اور طبقے کے لیئے کیوں لازمی ہے۔؟
۱۴- عالی دماغ اور ایماندار لوگ خالی کیوں نہیں بیٹھتے۔؟
۱۵- تکلیفات اور مصائب سے نجات کے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہے اور اصلیت کیا ہے؟
۱۶- ذاتی آسائش کے واسطے کسی عمدہ شغل کی کیوں ضرورت ہے۔؟
۱۷- ثابت کرو کہ کاہلی سے مرنے والوں کی تعداد محنت سے مرنے والوں کی تعداد سے زیادہ ہے؟
۱۸- درازی زندگی کے لیئے وقت سے کاموں کی تعداد کو کیوں ترجیح ہے۔؟
۱۹- چینیوں نے بوجھ لیجانے والوں کی عزت کیوں کی تھی۔؟
۲۰- گزشتہ کی عادت کے فائدے بیان کرو۔؟
۲۱- محنتی آدمی اپنی فرصت کے لئے مشغلہ کیوں نکال لیتا ہے۔؟
۲۲- محنت کی ضرورت جسمانی صحت اور دماغی قوت کے لئے کیوں ضروری ہے۔؟
۲۳- ثابت کرو کہ استقلال کی صورت بہتر ہوتی ہے۔؟
۲۴- کوشش اور جانفشانی سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟

کمال بے محنت کے حاصل نہیں ہوتا

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ جو خلقت زیادہ پائدار و استوار اور

پیدا ہوتی ہے وہ بہت سہج سہج بڑھکر مدتوں میں بالغ و پختہ ہوتی
ہے جو اچھی مضبوط لکڑیاں ہوتی ہیں اُن کے درخت بہت دیر کر کے
بڑھتے ہیں اور جانور جو بڑی عمر کے ہوتے ہیں وہ اپنی ماں کے پیٹ
میں بہت دنوں رہتے ہیں۔ پس یہی حال انسان کے دل و دماغ کی
اولاد کا ہے جو انشا پرداز اپنے مضامین کے لکھنے میں جلدی کرتے
ہیں۔ وہ اپنی رنگینی کے سبب سے پھولوں کی بہار دکھاتے ہیں اور
التفات کی نظروں سے دھوپ کی طرح روشنی چمکاتے ہیں۔ مگر موسم
کے بدلنے کے بعد تھوڑے دنوں میں نہ یہ بہار قائم رہتی ہے نہ
چمک۔ اول ہی نکتہ چینی کے جھونکے میں پژمردہ ہو جاتی ہیں اور
بے التفاتی کا پالا اُنکو مار جاتا ہے۔ پھر نہ کوئی اُنکو پڑھتا ہے۔
اور نہ دیکھتا ہے۔ جب ایک مصنف پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا
کہ تم برسوں تک اپنی تصنیفات پر سیکڑوں دفعہ نظرثانی کرتے ہو
اور پھر اُس کے بعد ایک چھوٹی سی کتاب نکالتے ہو اُس نے یہ
مختصر جواب دیا کہ میں ایک ایسی تصویر بناتا ہوں جو ہمیشہ قائم رہیگی
غرض جو انشا پرداز محنت نہیں کرتے اور نامور ہونے کیلئے
عجلت کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ہمجنسوں میں جواب نہیں
رکھتے تو وہ کیسے خیال کرسکتے ہیں کہ اُن کے کلام پر جو بیساختہ
اُن کے منھ سے نکل گیا ہے اُس پر لوگ توجہ اور التفات کریں گے۔
اور آیندہ زمانے میں وہ یادگار رہنے کا رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ بعض
آدمیوں کو خداداد استعداد ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ادنیٰ توجہ
سے جو تصنیفات کرتے ہیں وہ اس رتبے اور شان کی ہوتی ہے۔

کہ کوئی دوسرا اور اُس کو برسوں کی محنت اور جانفشانی اور غور و
مطالعہ کے بعد بھی نہیں کرسکتا اُن کا حال تو اُس قطعۂ زمین کا
سا ہوتا ہے کہ جس میں خود رو پیداوار کی وہ طاقت ہو کہ کسی
دوسری زمین میں محنت و تردد و آبپاشی کے بعد بھی نہ ہو۔ مگر ایسے
آدمی شاذ و نادر ہوتے ہیں بہت سے جھوٹے مدعی اُن کی قائم
مقامی کا دعوے کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم بے محنت و مشقت
کے نادر ہوجائیں گے۔ اُن کا حال ایسے کسان کا سا ہے کہ جو اپنی
زمین کو یہ سمجھے کہ وہ بغیر بوئے جوتے ایسے پھل پھول پیدا کریگی۔
جو دنیا میں بےنظیر ہوں گے۔

زمانے میں علم کے اندر بزرگی اِس وجہ سے بھی حاصل ہوجاتی
ہے کہ اس میں علم کم ہو۔ پس تھوڑے علم کا عالم بھی وہاں بےنظیر
ہوتا ہے کوئی اُس کے برابر نہیں ہوتا۔ جہاں رُوکھ نہیں وہاں
ارنڈ ہی برکھش ہے پس وہ اپنے تئیں بےنظیر سمجھکر صاحب کمال
جانتے ہیں اور اُس پر خوب اپھرتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ
صاحب کمال ہونا اور بات ہے اور جاہلوں اور نالائقوں میں
علم کی وجہ سے ممتاز ہونا اور بات ہے اُن کے ذہن میں کمال
کا مفہوم صحیح نہیں ہوتا۔ جو صاحب کمال کے معنی جانتا ہے
وہ اپنے تئیں ناقص سمجھتا ہے جب وہ اپنی تصنیفات کو کمال
کے معیار پر کرتا ہے تو اُس میں نقص پاتا ہے۔ ایک شاعر بےمثال
نے کہا کہ میرے شعر سب کو کامل معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مجھے
ناقص۔ ایک اور شاعر جس کے برابر دنیا میں تھوڑے ہی شاعر

گذرے ہیں، مرتے وقت کہتا تھا کہ یہ حسرت میں اپنے ساتھ لئے جاتا
ہوں کہ میں نے ہزار اپنی جان ماری مگر کبھی ایک شعر کامل نہ کہا گیا
ایک مصوّر بھی جو اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا مرتے وقت یہ افسوس
کرتا تھا کہ ساری عمر میں ایک دائرہ بھی کامل نہ کھینچ سکا۔

غرض پہلے زمانے میں جیسے علم ادب میں صاحب کمال گذرے
ہیں ویسے پچھلے زمانے میں نہیں گذرے اس کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ
انھوں نے صحیفۂ فطرت پڑھنے میں ایسی کوشش و محنت کی کہ
کوئی بات سواء اس کے متاخرین کے لئے چھوڑی نہیں کہ وہ ان ہی
کی نقل بری بھلی کیا کریں ہمیشہ وہ ایک علم کی طرف توجہ کرتے
تھے اور اسی کے اسرار جاننے میں محنت شاقہ اٹھاتے تھے۔ اگر شاعر
بننا چاہتے تھے تو نثر سے ہاتھ اٹھاتے تھے اور اگر نثر میں کمال پیدا
کرنا چاہتے تھے تو شعر نہیں کہتے تھے اس لئے پہلے زمانے میں بہت
ہی تھوڑے ایسے انشا پرداز گذرے ہیں کہ جن کو نظم اور نثر دونوں
میں کمال ہو۔ بلکہ نظم میں بھی وہ ایک قسم کی شاعری پر توجہ کرتے
تھے۔ اس زمانے کی طرح پہلے زمانے میں ہفتہ وار اور ماہوار اور
روزانہ اخبار نہ نکلتے تھے کہ جھٹ پٹ ان کی تصنیفات شایع ہوجاتی
اس لئے برسوں وہ ان کے گھر میں پڑی رہتی اور اس کی اصلاح کا
موقعہ ان باتوں سے ہاتھ لگتا۔ دشمنوں اور دوستوں کی رائے سے
نئے نئے معلومات اور نئے خیالات معلوم ہوتے۔ جب ذہن محنت سے
آرام پاتا ہے تو از سر نو پھر اس میں تازگی اور توانائی خیالات
کرنے کی پیدا ہوجاتی ہے۔ فرصت اور فراغت میں خود سوچنے

۴۔ محنت نہ کرنے کے نتائج تحریر کرو۔؟

۵۔ سکندر نے فتح فارس کے بعد وہاں کے باشندوں کے حالات دیکھکر کیا سبق حاصل کیا تھا؟

۶۔ شہنشاہ روس نے بستر مرگ پر اپنے سپاہیوں کو کیا وصیت کی تھی۔؟

۷۔ کاہلی کے متعلق ایک سیاح سے ایک شخص نے کیا سوال کیا تھا اور اسکا جواب کیا تھا؟

۸۔ آرام طلبی اور کاہلی کے نقصانات بیان کرو۔؟

۹۔ وقت کے ضائع کرنے کی بابت ایک دانشمند کا کیا مقولہ ہے۔؟

۱۰۔ ثابت کرو کہ کسی چیز کی حاصل کرنے میں جو دقت آ پڑے اسکا برداشت کرنا ضروری ہے؟

۱۱۔ فرصت کی قدر کب ہوتی ہے۔؟

۱۲۔ کاہلی کی زندگی کیوں قابل نفرت ہے۔؟

۱۳۔ محنت ہر گروہ اور ہر طبقے کے لئے کیوں لازمی ہے۔؟

۱۴۔ عالی دماغ اور ایماندار لوگ خالی کیوں نہیں بیٹھتے۔؟

۱۵۔ تکلیفات اور مصائب سے نجات کے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہے اور اصلیت کیا ہے؟

۱۶۔ ذاتی آسائش کے واسطے کسی عمدہ شغل کی کیوں ضرورت ہے۔؟

۱۷۔ ثابت کرو کہ کاہلی سے مرنے والوں کی تعداد محنت سے مرنے والوں کی تعداد سے زیادہ ہے؟

۱۸۔ درازی زندگی کے لئے وقت سے کاموں کی تعداد کو کیوں ترجیح ہے۔؟

۱۹۔ نپولین نے بوجھ لیجانے والوں کی عزت کیوں کی تھی۔؟

۲۰۔ محنت کی عادت کے فوائد بیان کرو۔؟

۲۱۔ محنتی آدمی اپنی فرصت کے لئے مشغلہ کیوں نکال لیتا ہے۔؟

۲۲۔ محنت کی ضرورت جسمانی صحت اور دماغی قوت کے لئے کیوں ضروری ہے۔؟

۲۳۔ ثابت کرو کہ اعتدال کی محنت بہتر ہوتی ہے۔؟

۲۴۔ کوشش اور جانفشانی سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟

کمال بے محنت کے حاصل نہیں ہوتا

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ جو مخلوقات زیادہ پائدار و استوار اور

دیرپا ہوتی ہے وہ بہت سہج سہج بڑھکر مدتوں میں بالغ و پختہ ہوتی ہے جو اچھی مضبوط لکڑیاں ہوتی ہیں اُن کے درخت بہت دیرکر کے بڑھتے ہیں اور جانور جو بڑی عمر کے ہوتے ہیں وہ اپنی ماں کے پیٹ میں بہت دنوں رہتے ہیں۔ پس یہی حال انسان کے دل و دماغ کی اولاد کا ہے جو انشا پرداز اپنے مضامین کے لکھنے میں جلدی کرتے ہیں۔ وہ اپنی رنگینی کے سبب سے پھولوں کی بہار دکھاتے ہیں اور اتفاقات کی نظروں سے دھوپ کی طرح روشنی چمکاتے ہیں۔ مگر موسم کے بدلنے کے بعد تھوڑے دنوں میں نہ یہ بہار قائم رہتی ہے نہ چمک۔ اول ہی نکتہ چینی کے جھونکے میں پژمردہ ہوجاتی ہیں اور بے التفاتی کا پالا اُنکو مار جاتا ہے۔ پھر نہ کوئی اُنکو پڑھتا ہے۔ اور نہ دیکھتا ہے۔ جب ایک مصنف پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ تم برسوں تک اپنی تصنیفات پر سیکڑوں دفعہ نظرثانی کرتے ہو اور پھر اُس کے بعد ایک چھوٹی سی کتاب نکالتے ہو اُس نے یہ مختصر جواب دیا کہ میں ایک ایسی تصویر بناتا ہوں جو ہمیشہ قائم رہتی۔

غرض جو انشا پرداز محنت نہیں کرتے اور نامور ہونے کیلئے عجلت کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ہمجنسوں میں جواب نہیں رکھتے تو وہ کیسے خیال کرسکتے ہیں کہ اُن کے کلام پر جو تیار ختہ اُن کے منھ سے نکل گیا ہے اُس پر لوگ توجہ اور التفات کریں گے۔ اور آیندہ زمانے میں وہ یادگار رہنے کا۔ یہ سچ ہے کہ بعض آدمیوں کو خداداد استعداد ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ادنیٰ توجہ سے جو تصنیفات کرتے ہیں وہ اس رتبے اور شان کی ہوتی ہے۔

کہ کوئی دوسرا اور اُس کو برسوں کی محنت اور جانفشانی اور غور و مطالعہ کے بعد بھی نہیں کرسکتا اُن کا حال تو اُس قطعۂ زمین کا سا ہوتا ہے کہ جس میں خود رو پیداوار کی وہ طاقت ہو کہ کسی دوسری زمین میں محنت و تردد و آبپاشی کے بعد بھی نہ ہو۔ مگر ایسے آدمی شاذ و نادر ہوتے ہیں بہت سے جھوٹے مدعی اُن کی قائم مقامی کا دعوےٰ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم بے محنت و مشقت کے نادر ہوجائیں گے۔ اُن کا حال ایسے کسان کا سا ہے کہ جو اپنی زمین کو یہ سمجھے کہ وہ بغیر بوئے جوتے ایسے پھل پھول پیدا کریگی۔ جو دنیا میں بینظیر ہوں گے۔

زمانے میں علم کے اندر بزرگی اس وجہ سے بھی حاصل ہوجاتی ہے کہ اس میں علم کم ہو۔ پس تھوڑے علم کا عالم بھی وہاں بینظیر ہوتا ہے کوئی اُس کے برابر نہیں ہوتا۔ جہاں رُوکھ نہیں وہاں ارنڈ ہی برکھش ہے پس وہ اپنے تئیں بینظیر سمجھکر صاحب کمال جانتے ہیں اور اُس پر خوب اکڑتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ صاحب کمال ہونا اور بات ہے اور جاہلوں اور نالائقوں میں علم کی وجہ سے ممتاز ہونا اور بات ہے اُن کے ذہن میں کمال کا مفہوم صحیح نہیں ہوتا۔ جو صاحب کمال کے معنی جانتا ہے وہ اپنے تئیں ناقص سمجھتا ہے جب وہ اپنی تصنیفات کو کمال کے معیار پر کستا ہے تو اُس میں نقص پاتا ہے۔ ایک شاعر بے مثال نے کہا کہ میرے شعر سب کو کامل معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مجھے ناقص۔ ایک اور شاعر جس کے برابر دنیا میں تھوڑے ہی شاعر

گذرے ہیں مرتے وقت کہتا تھا کہ یہ حسرت میں اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں کہ میں نے ہزار اپنی جان ماری مگر کبھی ایک شعر کامل نہ کہا گیا ایک مصوّر بھی جو اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا مرتے وقت یہ افسوس کرتا تھا کہ ساری عمر میں ایک دائرہ بھی کامل نہ کھینچ سکا۔

غرض پہلے زمانے میں جیسے علم ادب میں صاحب کمال گذرے ہیں ویسے پچھلے زمانے میں نہیں گذرے اس کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ انھوں نے صحیفۂ فطرت پڑھنے میں ایسی کوشش و محنت کی کہ کوئی بات سواء اس کے متاخرین کے لئے چھوڑی نہیں کہ وہ اُن ہی کی نقل بُری بھلی کیا کریں ہمیشہ وہ ایک علم کی طرف توجہ کرتے تھے اور اُسی کے اسرار جاننے میں محنت شاقہ اُٹھاتے تھے۔ اگر شاعر بننا چاہتے تھے تو نثر سے ہاتھ اُٹھاتے تھے اور اگر نثر میں کمال پیدا کرنا چاہتے تھے تو شعر نہیں کہتے تھے اس لئے پہلے زمانے میں بہت ہی تھوڑے ایسے انشا پرداز گذرے ہیں کہ جن کو نظم اور نثر دونوں میں کمال ہو۔ بلکہ نظم میں بھی وہ ایک قسم کی شاعری پر توجہ کرتے تھے۔ اِس زمانے کی طرح پہلے زمانے میں ہفتہ وار اور ماہوار اور روزانہ اخبار نہ نکلتے تھے کہ جھٹ پٹ اُن کی تصنیفات شائع ہو جاتی اس لئے برسوں وہ اُن کے گھر میں پڑی رہتی اور اُس کی اصلاح کا موقعہ اِن باتوں سے ہاتھ لگتا۔ دشمنوں اور دوستوں کی رائے سے نئے نئے معلومات اور خیالات معلوم ہوتے۔ جب ذہن محنت سے آرام پاتا ہے تو از سرِ نو پھر اُس میں تازگی اور توانائی خیالات کرنے کی پیدا ہو جاتی ہے۔ فرصت اور فراغت میں خود سوچنے

سے خیالات کی درستی ہو جاتی ہے۔ غرض اُن کی تصنیفات برسوں
کی محنت مشقت کا نتیجہ ہوتا تھا۔ پس جو لوگ کمال حاصل کرنا
چاہتے ہیں اور اپنی تصنیفات کو کامل بنانا تو اُن کو چاہیئے کہ وہ
برسوں محنت کیا کریں۔ اور طرح طرح سے اپنی تصنیفات کی جانچ
پڑتال کیا کریں۔ یہ خبط خیال میں نہ جما لیا کریں کہ جو بات ہمکو رات کو
سوجھتی ہے اور دن کو ہم اُسے شائع کرتے ہیں وہ صحیح اور درست
بھی ہوتی ہے۔ اِس طرح اُن کے خیالات بہت تاریک شائع ہونگے
اور جلد لوگوں کی نظروں سے تصنیفات گر جاسکیں گی۔ نفقط اُن سے
دو پانچ دوست ہی اُن کی تصنیف کی تعریف کرینگے وہ بھی تنگ کرینگے
اُن کی زندگی ہی میں اُن کی تصنیفات مردہ ہو جائیں گی۔

کمال حاصل کرنا بڑی محنت اور جانکاہی کا کام ہے برسوں کی
محنت اور مشقت سے بھی حاصل ہو جائے تو بہت غنیمت ہے کمال
حاصل کرنے میں بہت سہج سہج وقت اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے جو
پھول پتے سائے میں خشک ہوتے ہیں وہ بہت دنوں تک اپنے
رنگ اور سرسبزی کو قائم رکھتے ہیں۔ اور جو دھوپ اور آگ سے
سامنے آتے ہیں وہ جلد جھلس جاتے ہیں۔ پس اِسیطرح جس زمانہ
کی تعلیم تربیت میں ہوتی ہے وہ زیادہ دیرپا ہوتی نہیں۔ وہ
وقعت کی سختی اور زبردستی سے پختہ نہیں ہوتیں بلکہ وقت اور
استقلال سے۔

(۳) ایسے شخص کو کمال حاصل ہو سکتا ہے جو بے ریا دوست اور
سخت دشمن رکھتا ہے اِس لئے کہ دوستوں کی نصیحت سے وہ اپنی

خوبیوں پہ اور دشمنوں کی نکتہ چینی سے اپنے عیبوں پر آگاہ ہوگا۔

(۳) ہر چیز کے اندر کامل ہونے میں لوگ قصد کرتے ہیں مگر اکثر چیزیں ایسی ہیں کہ اُن میں کمال حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ جو کمال حاصل کرنے کا قصد کرتے ہیں اور اس میں بڑی محنت و جانکاہی کرتے ہیں وہ کمال کے نزدیک بہ نسبت اُن لوگوں کے پہونچ جاتے ہیں جو اپنی کاہلی اور مایوسی کے سبب سے کمال کا خیال اس وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم اس تک پہونچ سکتے نہیں۔

(۴) اگر تم وہ کمال حاصل کرنا چاہتے ہو جو تم میں نہیں ہے تو کبھی حالت موجودہ پر راضی نہ ہو اس لئے جس حالت سے تم اپنی خوش ہو جاؤ گے وہیں ٹھہر جاؤ گے جہاں تم نے کہا کہ مجھے کامل کمال حاصل ہو گیا وہیں سے زوال شروع ہو جائے گا۔ ہر کمالے را زوالے کے معنی یہی ہیں کہ جہاں آدمی نے یہ سمجھا کہ میرا کمال ہو گیا وہیں زوال شروع ہوا۔ ہمیشہ کچھ زیادہ کرو ہمیشہ آگے بڑھو ایک جگہ نہ ٹھہرے رہو نہ آگے جاؤ نہ بھٹکو۔

(مسٹر ذکاء اللہ)

سوالات

۱۔ ثابت کرو کہ جو چیز جلد بنجاتی ہے وہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔

۲۔ انشا پرداز کو ناموری حاصل کرنے کے لئے کس بات کی ضرورت ہے۔؟

۳۔ نکتہ چینی علم کی کس قدر ہوتی ہے۔؟

۴۔ پہلے زمانے کے اہل کمال آجکل کے اہل کمال سے کیوں فائق ہوا کرتے تھے:

۵۔ کیسے آدمی کو کمال حاصل ہو سکتا ہے۔؟

۶۔ محنت اور جانکاہی کرنے والے لوگ کمال کو کیوں پہونچ جاتے ہیں۔

۷۔ موجودہ کمال پر راضی رہنا کیسا زوال ہے۔؟

زبانِ گویا

اے میری بلبلِ ہزار داستاں! اے میری طوطی شیریں زبان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا۔ اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد۔ نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے کہ جس کے زہر کی دارو۔ نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے۔ کہ بچپن میں جب اپنے توتلے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے۔ کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی۔ اور اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا۔ روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تونے کہاں سیکھا ہے اور کس سے سیکھا ہے! کہیں تیری باتیں کس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل کہیں تو

زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت۔ ہماری ذلت۔ ہماری نیکنامی۔ ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور نہیں پہ موقوف ہے۔ تیری اس ہاں اور نہیں نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت میں نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادگی تیرا زیور ہے۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور میں زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے۔ اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشئے نہ چڑھا۔ اے زبان تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے۔ اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے۔ اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار اس نام کو عیب نہ لگانا۔ اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائیگا۔ اور تیری بساط میں وہی گوشت کا چھیچھڑا رہ جائیگا۔ کیا تجھکو یہ امید

سہنے کہ تو جھوٹ بولے اور طوفان اُٹھائے تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے۔ ورنہ زبون ہے بلکہ سراسر زیاں ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے۔ تو ہمارے منھ میں اور اوروں کے دل میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان جنھوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور جو تیرا حکم بجا لائے انھوں نے سخت الزام اُٹھائے۔ اور بہت پچھتائے۔ کسی نے فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ اور مُنھ پھٹ اُن کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا۔ اور کسی نے غماز غیبت اور بہتان۔ مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع۔ گالی اور دشنام جھگڑا اور ضلع۔ جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے۔ اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے! اے زبان یاد رکھ۔ ہم تیرا کہا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے۔ پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے۔ تو اپنے مالک کے

سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور اُنکا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں نہیں اور زبان پر ہاں۔

الٰہی اگر ہمکو رخصت گفتار ہے۔ تو زبان راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھکو اختیار ہے۔ تو زبان پر ہمکو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں۔ تو سچے بنکر آئیں۔ (حالی)

سوالات

۱۔ مصنف نے زبان کو کن کن القاب سے یاد کیا ہے۔؟
۲۔ مصنف نے زبان کی کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا نقائص تحریر کئے ہیں۔؟
۳۔ زبان کی ایک "ہاں" اور ایک "نہیں" پر کیا موقوف ہے۔؟
۴۔ زبان کی قوت کا نمونۂ قدرت الٰہی ہونا ثابت کرو۔؟
۵۔ زبان کے فرائض بیان کرو۔؟
۶۔ اگر زبان اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا کرے تو کیا نتیجہ ہو۔؟
۷۔ زبان کے کہنا ماننے والوں نے کیا کیا نقصانات اُٹھائے۔؟
۸۔ مصنف نے مضمون بالا میں گھوڑے اور کتے کی تمثیلیں کن کاموں کے لئے دی ہیں اور اُن سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو۔؟
۹۔ مصنف نے اس مضمون میں کیا دعا مانگی ہے۔؟

زمانہ حال اور ماضی کی خوش بیانی کا مقابلہ

مختلف ملکوں کے آئین اور قوانین اور اُن کے باشندوں کے اوضاع و اطوار ابتدائے آفرینش سے ہمیشہ تغیر پذیر رہے ہیں۔

آج جو رسم مرغوب ہے۔ کل وہی معیوب ہے۔ آج ہم ایک رواج کے پابند ہیں کل دوسرے پر کاربند۔ خوش بیانی آج وہ نہیں جو کل تھی۔ یوروپ کے ابتدائے زمانۂ تہذیب میں اسے بطور ایک فن کے تحصیل کرتے تھے اور مقرر کی قدر و قیمت فقط اس کی گویائی پر منحصر تھی۔ جمہوری ضروریات کے لحاظ سے متقدمین کی علمی استعداد حوالۂ زبان رہتی تھی۔ عام میلوں حرب گاہوں شاہی دعوتوں۔ اور عبادتخانوں میں شعرائے شیریں مقال اپنے دلاویز قصیدوں۔ پرجوش جنگنامہوں۔ محرک مناجاتوں سے غضب ڈھاتے تھے۔ مورخین تک قومی میلوں کی تقریب میں جمع ہوکر وہ دادِ فصاحت دیتے تھے کہ یونانیوں کے دقیقہ شناس گروہ وجد میں آکر بار بار تحسین وآفریں کے نعرے بلند کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس خوش بیانی نے تماشاگاہوں کو زینت بخشی۔ نظمی قصوں اور خشک شاعری نے دلچسپ کلام کے لئے پہلو خالی کیا۔ اس جماعت نے فصاحت و خوش بیانی کے لباس میں اپنے فرائض کو ایسے مہذبانہ طور پر انجام دیا کہ متاخرین آجتک دنگ ہیں۔ زمانۂ سلف میں سادہ بیان فلاسفر تک اپنے خیالات کو یوں ترتیب دینے لگے کہ وہ تقریر عام کا مضمون بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ فصاحت خیالات کا ایک معمولی لباس ہوگئی خاص غرض یہ تھی کہ بولنے والے کا خیال اس قدر موزوں ہو کہ کشش کرے۔ ایسا پختہ ہو کہ موثر ہو سکے۔ یہاں تک مضبوط ہو کہ سامعین کے حافظے میں مستقل طور جانشین ہوجائے۔ تحریک اور ترغیب کے حوصلے

اور سچے جوش سے اسپیکر کی تقریر دمبدم تازہ اور موثر ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ مجمع عام کے سامنے از سرتاپا تقریر نظر آنا سابق کے فصحا کا ایک ادنیٰ کمال تھا۔ ایسی حالت میں اُن کے اشارات حرکات و سکنات اور ترغیب کا حقیقی شوق کیونکر ممکن تھا کہ سامعین کو والہ و شیدا بنانے میں ناکام رہے۔ اسپیکر کے الفاظ میں ایک عجیب کشش مقناطیسی ہوتی تھی جو سامعین موافق و مخالف معتقد و غیر معتقد سب کے دلوں کو کھینچ لیتی تھی۔ یہ فصاحت فقط خالی آواز نہیں تھی۔ یہ وہ شعلہ صفت خیال تھے جو ایک عالی دماغ اسپیکر کے دل جوش سے نکلتے اور اُس کی طبعی لیاقت سے مزین ہوکر جلوہ گر ہوتے تھے۔ یونانیوں کے نکتہ چیں اور باریک بیں گروہوں کے سامنے عرصۂ بلاغت و میدان فصاحت میں قدم بازی کرنا دل لگی نہ تھا۔ اور یہ زمانۂ سابق کے فصحا ہی کے حوصلے تھے کہ رائے زنی کے خطرناک میدان میں آزادانہ جولانیِ طبیعت دکھاتے تھے۔ ایسے زمانے میں ہر ایک آدمی چاہتا ہے کہ میں خوش بیاں ہوجاؤں۔ اس کی وجہ کیا دلوں پر حکومت کرنا۔ عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لانا۔ انعامات حاصل کرنا۔ خطابات و ترقیات کا مستحق کہلانا۔ اسی ایک بیش بہا طاقت پر موقوف تھا۔ اس زمانے میں خوش بیانی کی منزلت یہاں تک حدِ اعتدال سے متجاوز ہوئی۔ بجاے اس کے کہ لوگ اُس سے مفید باتوں میں ترقی کریں۔ اپنے ہر ایک ارادے کے پورا کرنے کا اُسی کو ذریعہ سمجھنے لگے۔ رومانیوں کی فصاحت

بھی اسی وقت تک قابلِ قدر رہی جب تک اس میں بناوٹ کو دخل نہ ہوا۔ صداقت خیال کی روح ہے۔ خیال باطل محض بیہودگی ہے۔ زمانۂ گذشتہ کی فصاحت یا خوش بیانی اگر کامیاب ہوتی تھی تو زیادہ تر لفاظی و لسانی سے ہوتی تھی۔ زمانۂ حال کی خوش بیانی اس سے بہت کچھ متفاوت ہے۔ متاخرین نے جہاں اور علوم کو منجھے کر دیا ہے فصاحت کو بھی مدلل اور موزوں بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آج کل کے فصیح اپنے مضبوط سے مضبوط خیالات کو بھی لفاظی۔ زیادہ گوئی اور انواع و اقسام کی جادو بیانی سے ظاہر نہیں کرسکتے۔ اِلاّ اُس صورت میں کہ فی الواقع کوئی ملکی پیچیدگی کوئی لاینحل مسئلہ یا اشتعال خیز معاملہ زیر بحث ہو۔ جس میں دل معمولی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جوں جوں قانون کا احاطہ پھیلتا ہے تہذیب کا میدان وسیع ہوتا ہے۔ جوں جوں خیال میں سادگی اور باقاعدگی آتی ہے توں توں فصاحت کی لیاقت اور قدرت میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یقین نہیں کہ فصاحت کا دلی اُبھارنے والا افزائش ہو جائے۔ تاہم آجکل کے اسپیکر کے لئے اپنے الفاظ پر قادر ہونا اور اپنے دلائل کے استحکام سے باخبر رہنا از بس ضروری ہے۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آجکل کی فصاحت سابق کی طرح ستم برپا نہیں کرتی لیکن اس میں کلام نہیں کہ ابنا کی شاقت سے آجکل وہ دور دور سے کھینچ رہے جو پیشتر تھے۔

پریس نے اُس لاجواب طاقت کو کس قدر پست کر دیا ہے۔
اس نئی ایجاد کے ذریعے سے انسان ایک گوشے میں بیٹھے بیٹھے
اپنے خیالات کی اشاعت کر سکتا ہے۔ اس سے منفرد لیاقتیں تو
روز بروز ترقی کرتی نظر آتی ہیں۔ مگر ذہانت کی مدد کی اور بدیہۃً بالفعل اس قدر
کمزور ہوگئی ہے کہ اعلیٰ درجے کا انشا پرداز بولنے میں خاک اثر
پیدا نہیں کرتا۔ اور جو اسپیکر ہیں وہ طبّاع اور حاضر جواب نہیں
پائے جاتے۔ نہایت پرمغز تحریریں دیکھنے میں آتی ہیں مگر ایک مجمع
کے سامنے اسی قدر کی جادوبیانی اور دروغ‌گوئی آسان کام نہیں۔
جہاں مجمع کے روبرو کھڑے ہوئے ہوش و حواس ندارد
سب تیزیِ طرار ان معطل۔ دلائل بالکل لاطائل۔ الفاظ ہیں کہ
وبال ہوگئے۔ بولنا بلا کا سامنا عبارت کا مقابلہ ہوگیا۔ چند ہی
زندگان خدا نظر آئیں گے۔ جو اپنے خیالات پر اس قدر قادر
اور حاکم ہوں کہ بے تحاشا گفتگو کرسکیں۔ لوگ دن بدن خاموشی
سے مانوس ہوتے جاتے ہیں۔ رسالجات مطبوعہ کو سب سے الگ
تھلگ بیٹھکر جی بہلانے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی تقریر سننا
بھی تو سامعین اس سے اکتا کتابی عبارت سے ملانے لگے۔ اور طرفہ یہ
کہ جو بات سلف میں فصاحت کہلاتی تھی اب یاوہ گوئی سے موسوم
ہوگئی۔ ہمیں اپنی ضروریات کو خیال میں لاکر اپنی فصاحت
کو میزان میں تولنا چاہئے۔ کجا وہ فصاحت جسے جوش پر
خیال کہنا روا ہے قدیمی فصاحت کا مدعا ترغیب
تھا۔ حال کی فصاحت کا مقصد ترغیب کے علاوہ یقین

دلانا بھی ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ آجکل کے اسپیکر کو تعلقات
کار و بار فنونِ مختلفہ اور آداب و قواعد میں بہت کچھ درک ہو۔ غرضکہ
اِس زمانے میں فصاحت کے ساتھ قوّتِ مدرکہ کی صفائی ازبس ناگزیر
ہے۔ زمانۂ سابق میں نیک مفید ملکی اور سچی باتوں کے رواج پر زور
تھا۔ آجکل انصاف صداقت ترقی اور شرافت کا قائم رکھنا مدِّ نظر ہے
لہذا اسپیکر کے لئے معاملہ فہمی اور دقیقہ رسی میں احتیاط رکھنا
لوازمات سے ہے۔
(منشی چج رام صاحب۔ از رسالۂ فنِ تقریر)

سوالات

۱۔ خوش بیانی میں قدیم زمانہ سے اب تک کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔؟
۲۔ کن کن جماعتوں میں خوش بیانی کا رواج وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔؟
۳۔ زمانۂ سلف میں سادہ بیان فلاسفر اپنے خیالات کو کس طرح ترتیب دینے لگے تھے
اور ان کلام سے ان کی کیا خواہش تھی۔؟
۴۔ یونانی شائستہ جماعت کے [illegible] قدیم فصحا نے کس طرح کی تقریریں کیں۔؟
۵۔ رومنوں کی فصاحت کب تک قابلِ قدر رہی۔؟
۶۔ عیسائی مذہب نے فصاحت میں کس قدر دخل دیا ہے۔؟
۷۔ آجکل کے سپیکر کے لئے کس کس بات کی ضرورت ہے۔؟
۸۔ پریس کا اثر فصاحت و بلاغت پر کیا پڑا ہے۔؟
۹۔ آجکل کے فصحا جماعت کے روبرو کیسی تقریر کرتے ہیں۔؟
۱۰۔ قدیم زمانہ میں فصاحت کا مدعا کیا تھا اور اب کیا ہوتا ہے۔؟

خوش خلقی و نیک چلنی

۔ نامی اسپیکر ہونے کے لئے نیک چلن ہونا ایسا ہی ضروری ہے
جیسا کہ آئینہ کے لئے صفائی۔ بدچلن آدمی کے دل میں وہ توانائی

اور آزادہ روی ہی نہیں ہوتی جو خیالات کی پیدائش اور ان کے
اظہار کے لئے لازمی ہے جس شخص کو ہر وقت اپنے عیوب کا علم روند
ڈالتا ہے۔ اُس کا دل شوق ہمیشہ پابجولاں رہیگا۔ ہردم کی پشیمانی
دائمی ندامت فکر بلند کو پاس تک نہیں آنے دیتی۔ ایسا آدمی کوشش
کرتا ہے کہ اخلاقی مضامین یا مذہبی فرائض پر گفتگو کرے۔ مگر ہر لفظ
پر چونک اٹھتا ہے۔ بات بات پر دل میں خفت ہوتا ہے۔ حوصلہ و
ہمت کو پھر فراہم کرتا ہے۔ مگر خبث باطن کو کیا کرے۔ انفعال سے
لاچار ہے۔ آخر مین چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید۔ کا مضمون
دیکھکر خود ہی بیچارہ مضطرب ہو جاتا ہے۔ نیکی بذات خود ایک جوہر
ہے۔ اس سے طبیعت میں ایک آزادی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے کوئی
چیز نہیں پہونچتی۔ بلا خوف و خطر آزادانہ تقریر کرنے کے لئے انسان کا
طبعی طور پر خوش خلق و نیک چلن ہونا ضروریات سے ہے۔ نیک آدمی
خیر خواہی عوام کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بدخواہ کا دل زمین شور سے
بدتر ہے۔ جس سے کبھی پھول پھل کی تمنا نہ رکھنی چاہئے۔ خاصکر
وہ آدمی جو عیوب کی وجہ سے انگشت نما ہو کبھی بطور ایک اسپیکر کے
اثر پیدا نہیں کرسکتا۔ اُدھر کسی بدچلن آدمی نے زبان کھولی اِدھر
سامعین کے دلوں میں اُس کے ذاتی اطوار کے خیالات تازہ ہوگئے
آپس میں چشمکیں ہونے لگیں یار لوگوں نے فقرے پر فقرہ چست کیا
کسی نے آوازہ کسا۔ کسی نے پھبتی کہی۔ چلئے اسپیکر کے آئے حواس
غائب۔ برخلاف اِس کے اگر کوئی نیک آدمی انجمن آرا ہو خواہ اسکے
الفاظ بالکل بے تکے اُس کی تقریر محض لغو کیوں نہو۔ لیکن تاہم

اُس کا نیک چلن ہونا ہی بڑی بھاری سفارش ہے۔ صرف اُس کی نیکی کے خیال ہی سے سامعین کے دلوں میں اُس کی تنظیم۔ اُس کے خیالات کی قدر اور اُس کی باتوں کی توقیر پیدا ہوجاتی ہے۔ بہرحال اسپیکر کے لئے نیک ہونا اور نیک کہلانا واجب ہے۔
(منشی بنے رام صاحب۔ از رسالہ فن تقریر)

سوالات

۱۔ نامی اسپیکر کے لئے نیک چلنی کی کیوں ضرورت ہے۔؟
۲۔ نیکی کا اثر فصاحت پر کیسا پڑتا ہے۔؟
۳۔ بدچلن کی تقریر کا اثر سامعین پر کیوں برا پڑتا ہے۔؟
۴۔ نیک چلن کی تقریر مؤثر کیوں ہوتی ہے۔؟

مضمون نویسی

مضمون نویسی کوئی ایسی آسان اور سہل چیز نہیں ہے جیسا لوگ آجکل سمجھے ہوئے ہیں کہ آنکھیں بند کیں اور صفحے کے صفحے رنگ ڈالے۔ جبتک کسی فن کے قواعد سے پوری واقفیت نہ ہو اور نفس مدعا پر غور و خوض کرنے اور ترتیب کی قابلیت نہ ہو طبع آزمائی کرنا آنکھ بند کرکے راستہ چلنا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق چند مختصر قواعد انتخاب کرکے لکھے جاتے ہیں۔

مضمون نویسی میں نفس مضمون کو دیکھا جائے کہ کس بات پر یہ مضمون لکھا جاتا ہے۔ ابتدائی حالت میں عام فہم اور گرد وپیش افتادہ مضمون منتخب کیا جائے۔ جس میں آسانی ہو۔ اور جس مضمون کو لکھنا ہو پہلے اُس کے متعلق کافی طور پر کتابوں سے مادّہ

دماغ میں اکٹھا کرنا چاہیئے۔

مضمون میں پہلے تمہید مضمون کے مناسب لکھے اُس کے بعد نفسِ مطالب کی تشریح کر کے نتیجہ صاف طور پر نکالے۔ مضمون نویسی کا فائدہ یہ ہے کہ اُس سے معلومات بڑھتے ہیں اور واقعات کا ترتیب دینا آتا ہے۔ لارڈ بیکن کہتا ہے کہ پڑھنے سے انسان معقول ہوتا ہے اور مباحثہ سے مستعد اور لکھنے سے کامل ہو جاتا ہے۔

مضمون نویسی کے لئے لازم ہے کہ عالم فاضل معقول اور لائق انشا پردازوں کی تحریرات بغور پڑھو اور غور و خوض کی عادت ڈالو اور جہاں تک ممکن ہو احتیاط کے ساتھ لکھو۔ کیونکہ جس طرح زمین کو جتنا گہرا کھودا جائے اُسی قدر بیج کی عمدہ پرورش ہوتی ہے اور زیادہ بار آور ہوتا ہے۔ اسی طرح تحریر میں جس قدر غور سے کام لو مطالب و معانی کے پھل پھول دامن تلاش کو گوہر مقصود سے بھرتے ہیں۔

مضامین یا اخلاق پر ہوتے ہیں جیسے راستبازی دیانت داری نیک نامی وغیرہ یا علم پر جیسے عقل۔ دماغ۔ حافظہ۔ خواہش وغیرہ۔ دولت۔ تجارت یا تاریخ پر جیسے کسی کے حالات۔

عمدہ طرز تحریر کے لئے منتخب اور با موقع الفاظ ہونا چاہئے۔ اور ترتیب مضامین سلیقہ سے ہو۔ (مؤلف)

سوالات

۱۔ مضمون نویسی کے لئے کن کن باتوں کی ضرورت ہے۔؟
۲۔ مضمون نویسی کی تیاری کس طرح کرنی چاہئے۔؟
۳۔ مضمون کے حصے کس طرح ترتیب دئے جائیں۔؟

کتاب

اے میری سچی غمگسار۔ میری تنہائی کی مونس۔ رنج و راحت کی شریک
میری ادیب۔ میری مددگار۔ میری کتاب! تیری دلداری و غمخواری پر
میں نثار۔ ہر حرف تیرا غنچہ ہے اور ہر لفظ تیرا گلدستہ تیری لوح
و جدول سبزہ رخسار کے خط و خال سے زیادہ دلآویز ہے تیرے مصحف
رخ کی زیارت مسرت خیز و نشاط انگیز ہے۔

تو ارشاد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اور نیکی و پاکیزگی کا سرمایہ۔ تو
علم کی کان ہے اور اخلاق کی جان فروع و اصل عقل و نقل کا تو
خزینہ ہے اور سلف کی تحقیق و معلومات کا گنجینہ۔ تیری شعاع نے
دماغ کو روشن اور عقل کو مزین کیا۔ آدم خاکی تیری بدولت اشرف
مخلوقات ہوا۔ تو محرمِ راز و مخزن اسرار ہے۔ تو ہمارے بزرگوں
کی دماغ سوزی کی بہترین یادگار ہے۔ تو مظاہر قدرت کا منبع ہے
اور زمانے کی نیرنگی کا مرقع۔ ازل تیری ابتدا اور ابد تیری انتہا ہے

تو ایزد شناسی کی بسم اللہ ہے اور معرفت الٰہی کا ذریعہ۔ تو نے
ذاتِ باری کی وحدت ظاہر کی و منصفِ حقیقی کی معدلت۔ خدا پرستی
و خدا ترسی سکھائی۔ کارساز کریم کی کارسازی اور مشکلکشائی تو نے
بتائی۔ اس کی شانِ جلالت کی دلیل اور اس کے دریائے رحمت
کی سبیل تو نے دکھائی۔

دین کی قلمرو اگر تیری جاگیر ہے تو دنیا کی مملکت بھی تیرا سرمایہ
ہے۔ فضائے بسیط کا بسط۔ مادے کا ہیجان و حرکت۔ بحر مواج کی

روانی۔ کرۂ نار کی آتش فشانی۔ عناصر کی تعدیل و ترکیب۔ عالمِ دنیا کی تکوین و ترتیب۔ اور موالیدِ ثلاثہ تیرا دیباچہ ہے۔ نسلِ انسانی کے بانی حضرت آدم و حضرت حوّا کا بہشتی زندگی سے سیر کرنا۔ آب و گلِ دنیوی میں پھنسنا۔ دنیا کو دین کی طرح برتنا۔ اور ویرانۂ جہاں کو اپنے اہل و عیال سے بسانا تیرا مقدمہ ہے۔

بنی آدم کی ابتدائی اوقات گذاری۔ اُن کی عملی زندگی تدریجی ترقی اصلاحِ معاشرت۔ اشیا کی حقیقت۔ قانونِ قدرت سے واقفیت تیرا ایک دیوان ہے۔ موجوداتِ دنیا و کائناتِ عالم پر انسانی قبضہ تاریخ ازمنۂ سابقہ و قرونِ مختلفہ۔ مصر کی دانش۔ ہند کی بینش۔ فارس کی ذکی ہوشی۔ یونان کی روشن دماغی۔ اہلِ عرب کی حکمت آموزی۔ دانایانِ فرنگ کی بہرہ اندوزی۔ تیرا ایک سبق ہے۔ تو علم و عمل کی ہادی۔ ادب و معارف کی حامی ہے۔ تو ہر علم کی عاقل اور ہر فن کی کامل ہے۔ تواریخِ عالم تیرا ایک صفحہ۔ اور اگلی قوموں کا عروج و زوال تیرا خاکہ ہے۔ عروسِ دنیا کی رنگینی۔ زمانے کی بوقلمونی تیرے دمِ ست حسن کی پنگھا۔ آرائشِ عشق کی کارفرمائی تیرے قدم سے ہے تیرا ہر واقعہ عبرت خیز۔ اور تیرا ہر فسانہ حیرت انگیز ہے۔ شداد کے بہشت کی کیفیات۔ سکندرِ اعظم کی فتوحات خضر کا آبِ حیات تیرا دلربا فسانہ ہے۔ لیلیٰ و مجنوں کے جذبات۔ شیریں و فرہاد کے عشق کی واردات تیرا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

اصلاح تیرا کام ہے اور منتاح تیرا نام کہیں تو دشنوں کی

تقریر کرتی ہے۔ کہیں دشمنوں سے بچنے کی ترکیب بتاتی ہے۔ کہیں جلب منفعت کا گر سکھاتی ہے۔ اور کہیں دفع مضرت کا شوق بڑھاتی ہے۔ تو ایام گزشتہ کا صحیح نقشہ۔ قدما کا ہو بہو سراپا ہے۔ تو حیرت دہاں۔ اور ستر فطرت کی ترجمان ہے۔ تو یاس و ہراس میں تشفی دیتا ہے اور عیش و نشاط میں اعتدال کی تاکید کرتی ہے۔

تو آسائش دوگیتی کی تفسیر اور خواب راحت کی تعبیر ہے تو سیر زمین کونین و سیر دوش دارین ہے۔ تو عقل و فکر کی صیقل اور ذہن و جودت کی صیقل ہے۔ تو لڑکپن کی شفیق اور جوانی کی اتالیق اور بڑھاپے کی رفیق ہے۔ کوئی تیری فصاحت پر مائل اور کوئی بلاغت کا قائل ہے۔ تیرا ہر لفظ اخلاص کے پھولوں میں بسا اور تیرا ہر نقطہ عطر محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

تیرے قدر شناس صفحہ ہستی پر نقش رہیں گے۔ تیرے دلدادہ دامن فیض کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔

اے چشم بصیرت کی روشنائی! شکستہ دل کی مومیائی!! میری لیلائے معانی!!! تیری زلف گرہگیر کا میں اسیر۔ اے میری جان۔ میری ایمان! جب تک دم میں دم ہے تو میرے ساتھ ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی تو ہی میری وسیلۂ نجات ہے۔

(میرزا عابد حسین)

سوالات

۱. مصنف نے کتاب کو کن کن باتوں سے یاد کیا ہے اور ہر ایک نام کی کیا کیا دلیلیں ہیں؟

۳۔ کتاب کے فوائد بتاؤ۔؟
۴۔ ثابت کرو کہ دنیا و عقبیٰ دونوں کے لئے کتاب مفید ہے۔؟

کتب کا مطالعہ

مطالعہ تنہائی و عزلت میں خوشی بخشتا ہے گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا ہے۔ معاملات کے فیصلہ کرنے اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھاتا ہے۔ بس مطالعہ سے خوشی حسن بیان اور قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات اور مقدمات کو تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدمات و منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاح کی تدابیر جیسی کہ چاہئے اچھے عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور اُنکی باتوں کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو ٹھیک اور تسلیم کریں گے یا ہم خود بہت سی باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصد اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے۔ اور سوچیں گے۔ پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی اُن پر عمل کریں گے بعض کتابوں کا صرف مزہ چکھا جاتا ہے۔ یعنی اُن میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے بعض بالکل نگلی جاتی ہیں۔ یعنی کل پڑھی جاتی ہیں۔ مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں۔ یعنی اول سے آخر تک بڑی توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں کتابوں کے انتخابات سے جو کتابیں بنتی ہیں۔ اُن کا حال آب مقطر

کا سا ہے۔

آدمی پڑھنے سے کامل بنتا ہے۔ اس سے تقریر، نشست اور تحریر چست و درست ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ آدمی کو دانشمند و تجربہ کار بنا دیتا ہے۔ نظم کا طبیعت میں جودت پیدا کرتا ہے علوم ریاضیہ کا طبیعت کو ذکی بناتا ہے۔ اور علوم طبیعیہ کا ذہانت کو عمیق علم اخلاق کو سنجیدہ و متین۔ منطق و علم بلاغت و فصاحت کا مباحثہ و مناظرہ کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ غرض مطالعہ کا اثر ضرور انسان کے اوضاع و اطوار و کردار پر ہوتا ہے۔

انسان کے امراض جسمانی کے جیسے خاص علاج ہیں ایسے ہی امراض ذہنی کے بھی مخصوص علاج ہیں۔ سینہ و شش کا علاج شکار معدے کا علاج سہج سہج قدم چلنا۔ دماغ کا علاج گھوڑے پر سوار ہونا۔ علیٰ ہذا القیاس اور علاج ہیں۔ اسیطرح اگر ذہن میں آوارگی و پریشانی ہو تو علوم ریاضیہ کا مطالعہ اس کا علاج ہے۔ جو اُس کے ذہن کی پریشانی کھو دیگا۔ اگر ذہن بے تمیز ہے کہ دو چیزوں میں تمیز اور فرق نہیں کرسکتا۔ تو حکمت و فلسفہ اُس کا علاج ہے۔ اگر ذہن ایسا ہے کہ وہ ایک بات کے ثبوت سے دوسری بات کی توضیح نہیں کرسکتا۔ تو قانون دانوں کے فیصلجات کا بڑھنا اُس کی دوا ہے۔

غرض امراض ذہنی کے ایسے ہی علاج ہوتے ہیں۔ مطالعۂ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کاروبار زندگی کے معاملات میں بیوقوفوں سے۔ جو مطالعۂ کتب ہمارے

کاروبار زندگی میں کام نہیں آتا۔ اُس کو بھی بیکار نہ جانو۔ کیونکہ وہ ہماری عقل و فہم کو درست کرتا ہے۔ مطالعہ ہی ایک ایسا فن ہے جو اور فنون کے استعمال کو سکھاتا ہے۔ دانشمندوں کے کلام کے مطالعے پر جو نوجوان اپنے دماغ کو متوجہ کریگا تو ابتدا میں مسرت حاصل ہوگی۔ پھر دانائی کے ساتھ مواصلت کسی مطالعہ سے مضرت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر مطالعہ کے ساتھ مسرت ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ علم کے پیچھے پڑنے سے صحت کو مضرت پہونچتی ہے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کی عمریں بھی ایسی ہوتی ہیں جیسی اور پیشہ والوں کی۔ اس مشاہدہ کی صداقت کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے۔ طالبعلموں کی باقاعدہ اور آرام کی زلیست صحت و تندرستی کو زیادہ کرتی ہے۔ اور بہت سی تکالیف اور امراض سے بچاتی ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اپنی فضول حرارت جسمانی کو معتدل ورزش جسمانی سے کم کرتا رہے اور جسم کو کاہلی کا عادی نہ بنائے۔

آدمی اپنے وقت کاٹنے کے لئے حقہ پیتے ہیں۔ ہلاس سونگھتے ہیں۔ اور اُن سے مسرور ہوتے ہیں۔ اب اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ جو لوگ کسی فن اور علم کا مطالعہ کرتے ہیں اُن کا وقت کیسا خوشی سے کٹتا ہوگا ابتدا میں جو اس کے اندر محنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ آگے جاکر تفریح طبیعت ہوجاتی ہے۔

جب آسمان پر چاند کا لمپ روشن ہو تو یہ وقت تیرے

مطالعہ کے لئے اچھا ہے کہ تیری کتاب کے صفحوں پر چاندنی پڑے اور تو اُس میں باریک اور تاریک معانی کو دیکھے۔ اور چاند اور ستاروں کی سحرکاری کو سمجھے۔

نفس کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسے جسم کے واسطے ورزش۔ ورزش جسمانی سے جسمانی تنومندی اور تندرستی حاصل ہوتی ہے۔ مطالعہ سے نیکی جو روحانی صحت ہے۔ ہاتھ آتی ہے۔ ورزش سے جو خاص جسم کی تنادری کے لئے کی جاوے کچھ تکان ہوتا ہے۔ اسی طرح مطالعہ سے بھی جو فقط نکوکاری کے واسطے کیا جاوے کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ مگر جب کہیں پسندیدہ کام سے مسرت پیدا ہوتی ہے تو اُس کی تکلیف اور تکان کی پروا نہیں ہوتی۔ شکار کھیلنے سے مسرت و صحت ویسی حاصل ہوتی ہے۔ کہ اُس کی محنت نہیں معلوم ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی تمثیلات اور نقل و حکایات کی نصائح کے مطالعہ سے۔ انبساط و صحتِ روحانی حاصل ہوتی ہے اور اُس کی محنت کچھ نہیں معلوم ہوتی۔

بعض مطالعہ کرنے والے ایسے نادان ہوتے ہیں۔ کہ متقدمین کی وہ کتابیں مطالعہ میں رکھتے ہیں۔ جن کا بہت سا حصہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن جہاں کہیں کوئی مضمون اُن کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ تو خوشی کے مارے اُچھل پڑتے ہیں۔ اور کپڑوں میں پھولے نہیں سماتے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دس باتوں میں سے ایک سمجھ میں آئی۔ تو کیا آئی۔

(ہزکاء الصدم)

سوالات

۱۔ مطالعہ کے فوائد تحریر کرو۔؟
۲۔ چالاک آدمی اور عالم میں کیا فرق ہے۔؟
۳۔ پڑھنے کا کیا مقصد ہونا چاہئے۔؟
۴۔ کن کن علوم کے مطالعہ سے کیا کیا فوائد ہوتے ہیں۔؟
۵۔ امراض ذہنی کا علاج مطالعہ سے کیونکر ہو سکتا ہے۔؟
۶۔ دانشمندوں کا کلام مطالعہ کرنے سے نوجوانوں کو کیا کیا فائدے ہوتے ہیں؟
۷۔ ثابت کرو کہ مطالعۂ کتب سے صحت کو نقصان پہونچنے کا خیال غلط ہے؟
۸۔ ثابت کرو کہ مطالعہ ایک اچھا شغل ہے۔
۹۔ کیا ثبوت ہے کہ نفس کو مطالعہ ایسا نافع ہے جیسی بدن کے لئے ورزش
۱۰۔ کیسی کتابوں کا مطالعہ بہتر ہے۔؟

سفر

تحصیل علم کے دو طریقے ہیں۔ ایک اصولی۔ دوسرا عملی۔ جو علم کتب سے حاصل ہوتا ہے اُس کو (اصولی) اور جو سفر کے ذریعہ سے سیکھا جاتا ہے اُس کو عملی کہتے ہیں۔ اصولی قاعدہ عموماً دوسرے شخصوں کے خیالات یا اُن کے مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتا ہے برعکس اس کے ذاتی مشاہدے اور شخصی تجربے کا نام عملی طریقہ ہے۔ صورت اول میں ہم دوسروں کی مدد کے محتاج اور دست نگر ہیں اور شکل دوم میں ہم مختار اور آزاد ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ایک حالت میں ہماری رفتار کا انحصار بیرونی حرکت پر ہے اور دوسری صورت میں ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ پس ظاہری عملی طریقہ کا نقش نقش کالحجر کا حکم رکھتا ہے اور صحیح نتائج کے پیدا کرنے میں ہمشہ

معاون ہوتا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ انسانی زندگی دقتوں کی گتھی اور پیچیدگیوں کا مجموعہ ہے۔ کبھی انسان کو مصیبت و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی رنج و غم کا۔ اور کبھی غربت و نکبت کا۔ اور چونکہ عموعی شکل میں یہ ذکر رکاوٹیں ہیں۔ جو انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ عملی طریقے کو خیرباد کہے اور اصولی قاعدے سے اپنے علم کی پیاس کو فرد کرے اور صرف کتب بینی پر قناعت کرے۔ لیکن وہ مبارک شخص جو ان بلاؤں سے بری ہے یا پہلو میں ایک جوشیلا اور پر اُمنگ دل رکھتا ہے۔ کسی طرح محض مطالعہ کتب سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ اُس کا حیرت پسند دماغ اور اُس کا محقق دل اُس کو کبھی اجازت نہ دیں گے کہ مدرسے کے گوشے یا کتب خانے کی چار دیواری میں محدود رہے۔ شیخ سعدی۔ ابن بطوطہ۔ سرسید کی سوانح عمریاں ہمارے اِس دعوے کی مدلل ثبوت ہیں۔

طریقۂ عملی کی اِس قدر وضاحت اور تعریف سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ صرف سفر ہی تحصیل علم کا معقول ذریعہ ہے بلکہ مطالعہ کتب و اخبار بینی وغیرہ بھی اکتساب علم کے خاص ذرائع ہیں۔ اور اُس کے حاصل کرنے میں ایک معتدبہ مدد دیتے ہیں۔

سفر لغوی معنی کی رو سے صرف شہر سے باہر جانے پر دلالت کرتا ہے لیکن اصطلاحی معنی کے لحاظ سے بہت وسیع لفظ ہے۔ ہر ایک عجیب و غریب شے کو بنظر تحقیق مشاہدہ کرنے کے

علاوہ غیر ممالک کو دریافت کرنا نئی نئی تجارت سے مستفید ہونا
دنیا کے نشیب و فراز سے واقفیت پیدا کرنا۔ سفر کے معنی آخری
میں داخل ہیں۔ وہ قومیں جنھوں نے سفر کے مفہوم کو بخوبی
سمجھ لیا ہے اور اپنی زندگی کے مدعا میں دنیا کا سفر کرنا
بھی داخل کر لیا ہے آج ترقی کے فلک الافلاک پر صدر نشیں
نظر آتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم ہندوستانیوں میں جہاں
بدقسمتی سے اور بھی کئی عیوب موجود ہیں وہاں یہ عیب بھی
عموماً پایا جاتا ہے کہ ہمکو سفر کرنا نہیں آتا۔ حالت سفر میں
باوجود دونوں آنکھیں رکھنے کے اندھے اور باوجود صحیح دماغ
کے پگلے بن جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ سفر ہماری معلومات
میں اضافہ کرے اور اسی طرح ہماری روح کو فرحت بخشے
ہمارے لئے دوزخ کا ایک نمونہ بنجاتا ہے اور ہماری کوشش
یہ ہوتی ہے کہ جس طرح جلد ممکن ہو مکان میں حفاظت کے
ساتھ بند ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی یہ پرانی مثل
کہ "گھر کی آدھی باہر کی پوری سے اچھی ہے" ہندوستانیوں کی
رائے کا اظہار جو وہ سفر کی نسبت رکھتے ہیں صاف الفاظ
میں کہہ رہی ہے۔ کہ سفر اور سقر میں بہت کم فرق جانتے
تھے۔ برخلاف اس کے اہل فرنگستان و اہل امریکہ کو ملاحظہ
فرمائیے اور ان کے حالات کو پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا
کہ سفر ان کی زندگی کا جزو اعظم ہے۔ وہ سفر میں حیات
ابدی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یوروپ اور

امریکہ علم کے معدن تہذیب کے منزل اور اخلاق کے مسکن بنے ہوئے ہیں۔ ہماری کوئی بات خواہ استدلال ہی پر کیوں نہ مبنی ہو اُس وقت تک شرف قبولیت نہیں حاصل کرتی جبتک یورپ یا امریکہ اپنی معیار میں وزن کرکے اُس کو پوری نہ اُتار دے
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

خیر خدا خدا کرکے بعض ہندوستانیوں میں سفر کا شوق بھی پیدا ہوا ہے تو وہ یورپ اور امریکہ میں جاکر بجائے اس کے کہ اُن کے اعلیٰ اوصاف اُن کی تجسس طبیعت۔ اُن کے علم و کمال سے بہرہ ور ہوں خوب گلچھرے اُڑاتے ہیں۔ اور جب واپس آتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتے ہیں۔ اور مطلب کی بات ندارد۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اُصول سفر آپ کے گوش گذار کئے جائیں۔ ان اُصولوں کو بیان کرنے سے پیشتر یہ گزارش ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل اُمور کا اپنے کو پابند بناؤ۔

۱۔ جس مقام کی سیر کرنا منظور ہے اُس کے مجمل حالات سے اگر ممکن ہو پہلے ہی آگاہی حاصل کرلو۔

۲۔ ایک روز نامچہ اپنے ساتھ رکھو جس میں ہر ایک قابل ذکر چیز کا حال درج کرو۔

۳۔ نہایت ضروری ہے کہ اخلاقِ پسندیدہ اور اوصافِ حمیدہ سے اپنے کو آراستہ کرکے قدم باہر نکالو۔ چال چلن اور خصلتوں کو اس قدر مضبوط اور راسخ بنالو کہ غیر ممالک کی ناجائز

دلفریب ادائیں تم پر اپنا جادو نہ چلا سکیں ورنہ گمان غالب یہ ہے کہ پردیس بجائے رحمتِ الٰہی کے قہرِ ذوالجلال بن جائے۔

اس قدر پابندی کے بعد سفر یقینی نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگا بشرطیکہ مندرجۂ ذیل اصول نظر انداز نہ کئے جائیں۔

۱۔ قوتِ فیصلہ کو صحیح قاعدے پر پیدا کر کے کام میں لاؤ۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ تم سفر کے اصلی مطلب کو فوت کر دو۔ اور غیر ضروری چیزوں کو با وقعت سمجھو۔ میں اس موقع پر قابل مشاہدہ چیزوں کی ایک طویل فہرست پیش کرتا ہوں جو کم و بیش ہر مقام پر پائی جاتی ہیں۔ بادشاہوں کا دربار خصوصاً اُس موقع پر جبکہ سفیروں کو باریابی کا موقع حاصل ہو۔ عدالتیں جبکہ اُن میں مقدمات پیش ہوں۔ عبادتگاہیں خانقاہیں۔ تمدن م یادگاریں۔ بندرگاہیں۔ برباد شدہ کھنڈرات کتب خانے۔ مکاتب۔ مختلف کارخانجات۔ محلات۔ باغات۔ توشہ وسلاح خانجات۔ لین دین کے بازار۔ شہ سواری کے کرتب۔ اور دوسری کسرتیں۔ فوج کی قواعد۔ اور وہ چیزیں جو اُس شہر کی خصوصیات سے ہوں۔

۲۔ اُس مقام کی جہاں کا قصد ہے زبان سے کم و بیش واقفیت پیدا کرو۔ تاکہ اُس مقام کو اُس کی اصلی شکل میں دیکھ سکو۔ اور وہاں کے تمدنی۔ معاشرتی۔ اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈال سکو۔ اور اپنے علم میں اضافہ کر سکو۔ چونکہ ہر ملک کی زبان سیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے انگریزی

زبان کے سیکھنے پر اکتفا کرو۔ کیونکہ رُوئے زمین کے کُل علمی خزائن
اُس میں محفوظ ہیں۔ اور کرۂ ارض کی دوسری زبان ہونے کا
اُس کو شرف حاصل ہے۔

۳۔ قابل مشاہدہ چیزوں کے انتخاب میں۔ اور اُن کو استقلال
سے معائنہ کرنے میں ہوشیاری سے کام لو۔ اور صرف اپنے ہی مذاق
کے مطیع نہ بنجاؤ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک حجّام سے جس نے
اِس سے پیشتر دربارِ شاہی میں دخل نہیں پایا تھا۔ دریافت کیا گیا
کہ اُس نے وہاں کیا دیکھا۔ جواب دیا۔ کہ بادشاہ کے بال عمدہ
طریقے سے تراشے ہوئے تھے۔ بیچارے حجّام ہی پر کیا منحصر ہے۔
سوداگر بندرگاہوں اور لین دین کے بازاروں کو خاص طور سے
مشاہدہ کرتے ہیں۔ سپاہی قلعوں سلاح خانوں اور میگزینوں کو
طلبہ کتب خانوں اور مباحثوں کو۔ مدبّر عدالتوں کو۔ غرضکہ ہر ایک
شخص اپنے پیشہ اور مذاق کا گرویدہ ہے۔ اور دوسری نادر چیزوں
سے ناآشنا نظر آتا ہے اِسی طرح اِس میں ایک خاص کمی باقی
رہجاتی ہے جس کا دور کرنا رفتہ رفتہ اُس کی قدرت سے باہر ہو جاتا ہے

۴۔ غیر ممالک میں سفیروں اور سکتّروں سے ملاقات کرو۔ تاکہ
تمکو اور ممالک کے حالات بھی معلوم ہو جائیں۔ اُن بزرگوں کی
زیارت بھی ضرور کرو۔ جو لازوال شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ تاکہ
تم کو معلوم ہو جائے کہ زندگی اور شہرت میں کس طرح کا رابطہ
پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تم سفر سے واپس آؤ تو اُس ملک سے
بالکل تعلق قطع نہ کرلو۔ بلکہ وہاں کے واقفکاروں سے خط و

کتابت کو جاری رکھو۔ تاکہ وہاں کی تبدیلیاں اور حالات تم کو معلوم ہوتے رہیں۔

۵۔ یہ موقع دو کہ دوسرے شخص تم سے سفر کے متعلق سوالات کریں تم اپنے مشاہدے کو خود بخود بیان نہ کرو۔ اپنے خیالات جذبات اور مشاہدات پر پورا پورا تجسّس رکھو۔ اور موقع اور محل پر انکا اظہار اپنے دوستوں کی موجودگی میں کرو۔ قرین قیاس واقعات کے بیان کرنے میں اختصار سے کام لو۔ اور خاصکر عوام کے سمجھانے میں۔ ورنہ وہ بجائے عمدہ رائے قائم کرنے کے تمہارے تجربات کو قصہ کہانی سے تعبیر کریں گے۔ فارسی کی ضرب المثل "جہاندیدہ بسیار گوید دروغ" ایسے ہی سیاحوں کی لفاظی اور فضول گوئی کا نتیجہ ہے جو اصول مذکور پر عامل نہیں ہیں۔

اور نئے ممالک میں جاکر اپنے طریق معاشرت اور طرز تمدن و آداب کو بالکل فراموش نہ کرو اور وہاں کی ہر ایک شے کے عاشق نہ بنجاؤ۔ بلکہ خذما صفا و دع ماکدر پر کاربند رہو۔ اور بعض عمدہ باتوں کو سیکھکر اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کرو۔

یہ ہیں وہ اصول جن کی پابندی نے یوروپ کو یوروپ اور امریکہ کو امریکہ بنا دیا اور اُن کی خلاف ورزی نے ہندوستان کو اُبھرتا تو کیا اصلی حالت پر قائم نہیں رکھا۔ اِس فرق کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔ع بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔

(حامد حسین رضوی)

سوالات

۱۔ تحصیل علم کے کے طریقے ہیں ہر ایک کا مفصل حال بیان کرو؟

۲۔ شیخ سعدی۔ ابن بطوطہ اور سرسید کی سوانح عمریاں کس دعوے کی مدلل ثبوت ہیں۔؟
۳۔ سفر کے لغوی اور اصطلاحی معانی بیان کرو؟
۴۔ ہندوستانی سفر کو برا کیوں جانتے تھے۔؟
۵۔ ہندوستانی یورپ اور امریکہ کے سفر سے کما حقہٗ فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔؟
۶۔ سفر میں کن امور کا لحاظ ضروری ہے اور کیوں۔؟
۷۔ سفر کے وہ اصول بیان کرو جن سے وہ یقینی نعمت غیر مترقبہ ہوسکے۔؟
۸۔ کن اصول کی پابندی سے یوروپ یوروپ اور امریکہ امریکہ بنگیا ہے۔؟

لندن

لندن ایک بہت وسیع اور غدّار شہر ہے۔ اِس کی اصلی وسعت کا اندازہ ہندوستان کے کسی شہر سے نہیں کیا جاسکتا۔ دلّی اور علی گڈھ لندن کے چند گلی کوچے ہیں۔

شہر مختلف اضلاع میں منقسم ہے اور ہر ضلع گویا ایک علٰحدہ شہر ہے۔ پس لندن کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے تک پہونچنے کے لئے وہی وسائل درکار ہیں جو ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانے کے لئے۔

تمام لندن کی سرزمین کے نیچے زمین دوز راستے ہیں جن پر ہر ہر دو میل کے فاصلہ سے ایک اسٹیشن بنا ہے۔ اِن زیر زمین اسٹیشنوں میں مسافر لفٹ کے ذریعہ سے نیچے آتے ہیں۔ اور ریل پر سوار ہوکر جہاں ضرورت ہو جاسکتے ہیں۔

سطح زمین پر ٹرام برقی ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی ہے۔ اُس کی وضع بالکل بمبئی کی ٹرام سے مشابہ ہے۔ لاتعداد ہروقت

ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی رہتی ہیں۔ ایک قسم کی موٹرگاڑیاں بھی ہیں۔ یہ بھاپ سے چلتی ہیں۔ ان کی تعداد بھی کثیر ہے۔
علاوہ بریں ٹیکسی موٹرگاڑیاں ہیں۔ جہاں دیکھئے قطاروں کی قطاریں سڑک کے وسط میں ایستادہ ہیں۔ ان میں یہ انتظام ہے کہ میٹر کے ذریعہ سے کرایہ خود بخود تحریر ہوتا رہتا ہے اور اسی حساب سے دینا پڑتا ہے۔ گھوڑا گاڑیاں یہاں کم ہیں مگر پھر بھی بکثرت ہیں۔ باوجود اس کے یہ ذرائع ضروریات کے لحاظ سے محض ناکافی ہیں۔
آب و ہوا میں یہ شہر کوئٹہ سے مشابہ ہے برف باری کے زمانے میں اگرچہ سردی زیادہ ہوتی ہے بالعموم ترشح ہونے کے باعث ہمیشہ ابر محیط آسمان رہتا ہے۔ اور آفتاب کی صورت ہفتوں نظر نہیں آتی۔ بارہا صبح سے شام تک چراغ اور فانوس روشن رہتے ہیں۔ یہاں کا کہرا ایک بلائے عظیم ہے جسکا اندازہ مشکل ہے۔ جب کہرا چھا جاتا ہے تو پھر ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ شعلہ پردۂ فانوس سے باہر نہیں آسکتا۔ تمام آمدورفت بند ہو جاتی ہے۔ اور لوگ قریب ترین مامن میں پناہ لیتے ہیں۔ مگر ایسا کہرا ایک شاذ چیز ہے۔ اور صرف ایک بار میرے تجربہ میں آیا۔
عظمت برطانیہ حقیقت میں یہاں آکر معلوم ہوتی ہے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ نظم حکومت کے قواعد تبدیل ہوگئے ہیں کہ ہندوستان یا ایشیا کے رہنے والوں کو اس کا ذہن نشین کرنا از حد مشکل ہے۔ اگر کوئی یہ دریافت کرے کہ اس تہذیب و تمدن کا سچ

شہریت کیا ہے تو میں یہ کہونگا - آزادی - اور اگر مجھسے یہ دریافت کیا جائے کہ آزاد ملک کی کیا تعریف ہے تو میں یہ جواب دونگا ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را باکسے کارے نباشد

ارسطو کا قول ہے کہ عدم مساوات سے زیادہ کوئی شے قوتوں کو پژمردہ اور مغلوب نہیں کرتی اور چونکہ ایشیا مدتوں تک مطلق العنان حکومتوں کی خلافت گاہ رہی ہے اہلِ ایشیا لفظِ آزادی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں -

یہاں ہر امیر اور فقیر مفلس اور تونگر شہری ہونے کی حیثیت سے ہمپایہ ہیں - ہر شخص اپنا فرض ادا کرنے اور منصب بجا لانے تک پابند ہے - اس سے زیادہ اس پر کوئی قید نہیں ملازم کو آقا سے خائف ہونے کی اور ماتحت کو افسر کی سفارش کی کوئی حاجت نہیں کوئی حاکم بالا دست اپنے محکوم سے بیجا بازپرس نہیں کرسکتا اور کوئی آقا ملازم پر دست تعدی دراز نہیں کرسکتا - قانون نے میزانِ عدل میں نوکر جو حقوق تفویض کردیے ہیں - اُن کی خلاف ورزی کی حالت میں عدالت چارہ وہ ہے اور کسیکو ایسی جسارت نہیں ہوتی کہ انصاف کو اپنے ہاتھ میں لے لے -

جب سرِ راہ پولیس کا سپاہی اپنی ایک اُنگلی سے منع کردیتا ہے تو عوام کیا خواص خواہ سر پر قیامت ہی کیوں نہ آسکے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرسکتے - اور وہ ادنٰے ملازم حکومت خود اسقدر پابندِ قانون اور آگاہ فرائض ہے کہ ضعیف عورتوں - اپاہج اور معزور لوگوں اور معصوم بچوں کو خود ایک جانب سے

سڑک کے دوسری جانب تک بحفاظت پہونچا دیتا ہے۔ اور راستہ بھولے ہوئے کو خضر راہ بنکر منزل کا پتہ اور نشان دیتا ہے اور ہر وقت ہر معاملہ میں مدد کو تیار ہے۔ ہر شخص کی حکومت اُس کے دفتر تک محدود ہے اس کے بعد کوئی کسی کا حاکم نہیں۔

جہاں یہ لوگ قانوناً اِسقدر آزاد ہیں وہیں تمدّن کی زنجیروں سے اِسقدر بستہ ہیں، کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ بارِ حکومت جہاں اِسقدر کم ہے۔ وہیں بارِ علائق اسقدر زیادہ ہے کہ شاید اِس سے زیادہ سرگراں قوم ادر نہ ہو۔

اخلاق میں یہ لوگ نمونہ ہیں۔ ملازموں کی مستعدی اور فرماں برداری بیان سے باہر ہے۔ اپنا فرض منصبی بجا لانے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ دوکانوں اور قہوہ خانوں کے ملازمین مرد اور عورتیں اِس خوبی اور خوشکلامی سے اپنا کام کرتے ہیں کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اِن کی سلیقہ شعاری اور مستعدی کو تجارت کے فروغ میں بڑا دخل ہے۔ جس شخص سے راستہ دریافت کیجئے بچّہ اور بڑا اپنا کام حرج کرنے اور ہمراہ جانے کے لئے تیار ہے۔ اگر کوئی شے گر جائے تو ہر شخص کوشش سے تلاش کے بعد آپ کو پہونچا دیگا۔

قومی اعتبار اِس درجہ ہے کہ بہت سی چیزوں میں نہ رقعہ ہے نہ رسید مگر کسی قسم کے دھوکے کا احتمال نہیں۔ تمام لندن کیا مکانات اور کیا دوکانیں ایک شیشہ خانہ ہے۔ دوکانیں تمام کھلی ہوئی ہیں صرف شیشے جڑے ہیں۔ مکان سامنے سے صرف شیشے کی کھڑکیوں سے بند ہیں جن کے سامنے کوئی لوہے کی سلاخیں یا محافظت نہیں۔

اتوار کے روز کوئی اپنے گھر سے دوکان نہیں جاتا۔ تمام کاروبار بند رہتا ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی شخص جرأت کرکے اِن کمزور شیشوں کے پیچھے سے ایک پائی کی چیز اٹھائے۔ جوہری بازار میں ایک شیشے کے پیچھے بعض وقت اتنا مال ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کی کسی ریاست کی فروخت سے روپیہ جمع کیا جائے تو اُس کا نصف نہ ہو۔

یہاں کے لوگوں میں علم اور دولت دونوں مجتمع ہیں۔ دولت یہاں بے اندازہ ہے۔ اس کا خیال بھی ہماری حد امکان سے باہر ہے۔ یہاں ایک گزارہ کرنے والے آدمی کا صرف ذاتی خرچ ہفتہ وار [illegible] پونڈ ہے۔ اور جس خاندان میں چار آدمی مع بچوں کے ہوں اور تیس پونڈ آمدنی ہو وہ خاندان غریب ہے۔ یہاں کے غربا ہمارے سفید پوش شرفا سے بہتر حالت میں ہیں۔ عظیم الشان عمارات کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اور ایک ہوٹل کی عمارت کی قیمت ہماری ایک بستی سے زائد ہے۔ ہر قہوہ خانہ ایک بہارستان ہے۔ سڑکیں از حد وسیع اور کشادہ ہیں اور دونوں جانب پیادہ چلنے کے راستے ہیں۔

اِس لاانتہا دولت کے اجتماع کا باعث تجارت ہے۔ یہاں تاجر سے بڑھکر کوئی شخص صاحب جاہ نہیں۔ ہر سال تاجروں میں سے ایک شخص شہر لندن کا افسر اعلیٰ مقرر کیا جاتا ہے۔ دوکانوں کا طول عرض بیان سے باہر ہے بڑی دوکان کے محض سیر کرنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو یہاں مہیا نہ ہو۔

ع۔ چو نانگہ مدانہ ہے خاطر خواہ ہوسکے

غرض لندن ایک عجیب و غریب مقام ہے جہاں بے انتہا دولت جمع ہے۔ جو جملہ ممالک کا مخزن ہے جو سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہے۔ جہاں ان عجائبات دنیا کا دیکھنا تعجب اور رشک کا باعث ہے وہیں انسانی سوسائٹی کی اندرونی حالت کو دیکھ کر تاسف کرتا ہے۔

ان ترقی سے اگر اپنے تنزل کا مقابلہ کیا جائے تو سوینا سعدی کا قول یاد آتا ہے جہاں ایک پیر دانا نے یہ کہا ہے کہ جس قوم میں سخاوت۔ علم۔ دولت میں سے کوئی شئے نہ ہو اس پر بجلی کا گرنا بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا ہے

مجھے ڈر ہے اسے میرے بقوم یارو مبادا کہ وہ ننگ عالم نہیں ہو

(مولوی عبدالرحمن بجنوری بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی)

سوالات

۱۔ لندن کیسا شہر ہے اس کی وسعت اور اس کے حصص میں آمد و رفت کے وسائل بتاؤ
۲۔ لندن کی آب و ہوا کی نسبت کیا جانتے ہو؟
۳۔ لندن میں کہرے کی کیا کیفیت ہوا کرتی ہے۔
۴۔ لندن میں لوگوں کی آزادی کے متعلق تم کو کیا معلوم ہے اور ارسطو کا قول درمع مساوات کی نسبت کیا ہے۔؟
۵۔ لندن میں حاکم۔ محکوم اور افسر ماتحت کے برتاؤ کیسے ہوتے ہیں۔؟
۶۔ لندن میں پولیس کے سپاہی کن کن خدمات کو بجا لاتے ہیں اور وہ رعایا کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔؟
۷۔ اہل لندن کے اخلاق کی نسبت تم کیا جانتے ہو۔؟
۸۔ لندن میں قومی اعتبار کی کیا کیفیت ہے۔؟
۹۔ اہل لندن کے عمود دولت کا حال بیان کرو۔؟

۱۰- لندن میں دولت کی زیادتی کا کیا سبب ہے۔؟
۱۱- لندن - جملہ فنون کا مخزن کیوں ہے۔؟
۱۲- لندن کی ترقی اور اپنے شہر کے تنزل کا مقابلہ کرو۔؟

ترقی کا اعلےٰ ذریعہ تجارت ہے

سب سے زیادہ دور اندیش اور ہوشیار قوم وہ ہے جو اپنی قوت علمیہ اور کمال عقلیہ سے ہر چیز میں ایک قسم کی ترقی دینے کا مادہ رکھتی ہو۔ اور جو افعال اُس سے سرزد ہوں وہ اُس مادّے کے مناسب ہوں اور اوسط درجے کی قوم وہ ہے جو خود کسی ایجا یا ترقی کا مادّہ تو نہ رکھتی ہو۔ مگر جو سامان اُس کو پہلے لوگوں کی عقل کی بدولت مہیا ملا ہے یا جو قدرتی طور پر اُس کو میسّر آسکتا ہے۔ اُس کو اپنی حالت پر محفوظ رکھ سکے اور جو فائدے اُس سے اوروں نے حاصل کئے ہیں۔ وہ فائدے یہ بھی حاصل کرسکے اور جو قوم نہ کسی چیز میں ترقی دے سکے اور نہ اُس کو اپنی حالت اصلی پہ محفوظ رکھ سکے۔ بلکہ اُس کو اور تنزل کے مرتبے پر پہونچادے - اور اپنی سستی اور غفلت کے سبب سے اُس کی ہستی خراب کردے۔ وہ سب سے گئی گذری اور نا عاقبت اندیش قوم ہے اور یقیناً وہ اس قابل ہے کہ اپنی تمام ضروریات زندگی میں اوروں کی محتاج اور سب کی نظر میں ذلیل رہے۔

جب ہم یہ بات بیان کرچکے۔ تو اب ہمکو دیکھنا چاہئے کہ یہہ ہماری قوم جو ہندوستانی کے نام سے مشہور ہے۔ کس قسم کے لوگوں میں شمار ہونے کے قابل ہے؟ ہماری رائے میں وہ سب سے اخیر

قسم کے لوگوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔جس نے بجاے اِس کے
کہ وہ اپنی جملہ ضروریات میں ترقی کرتی ہر چیز کو بگاڑ رکھا ہے
اور اپنے تمام کاروبار اور جملہ اشیاے ضروریہ کی فراہمی کو اور
قوموں کے حوالے کردیا ہے۔

پس اِس کا آخری نتیجہ بجز اِس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا
کہ آخرکار تمام ہندوستان مفلس ہوجائے گا۔اور اُس کی آمدنی
کے سرچشمے غیر قوموں کے ہاتھ آ جائیں گے۔

دیکھو! معاملاتِ تعلیم و تربیت میں جو اصل الاصولِ ترقی ہیں
ہندوستانیوں نے بالکل اپنے حکّامِ وقت پر بھروسا کرلیا ہے اور
اِس بھروسے کو یہاں تک ترقی دی ہے۔کہ اگر آج حکّامِ وقت
اپنے سررشتۂ تعلیم کو توڑ دیں یا اُس سے توجہ اُٹھا لیں۔تو ہمکو
امید نہیں کہ ہندوستان کا ایک ضلع بھی وہاں کے باشندوں
کی تعلیم کا کچھ فکر کرسکے۔باب تجارت میں ہندوستانیوں کو اِس سے
زیادہ کچھ نہیں آتا۔کہ وہ اپنے ملک کی پیداوار کو بھی اوروں
کے ہاتھ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کرتے رہتے ہیں اور آخرکار
اُس پیداوار کے نتیجے کو جو اور قومیں اپنی صنّاعی سے پیدا کرتی
ہیں نہایت گراں قیمت پر فروخت کرتے رہتے ہیں۔عام ملکی ضروریات
میں ہندوستان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ انگلستان کے ماتحت
نہوتا اور انگلستان سا ترقی یافتہ ملک اُس پر حکمراں نہوتا تو شاید
وہ ایسی چیزوں سے محروم رہتا جو اِس وقت اُس کے حال میں ہیں
اور جن کے سبب سے اُس میں تھوڑی شایستگی معلوم ہوتی ہے۔

پس جب اُس مُلک کے باشندوں کی یہ حالت ہو تو کیونکر اُسکو اپنی ضروریات میں کامل خیال کرسکتے ہیں۔ اور کب اس بات کا یقین ہوسکتا ہے کہ جس مُلک کی دولت اور مُلک کو چلی جاتی ہے وہ ہمیشہ مالدار رہیگا۔

آمدنی کے ذریعوں میں ظاہرا دو ذریعے ایسے معلوم ہوتے ہیں جو تمام ذرائع کو حاوی ہیں۔ ایک زراعت اور دوسرا تجارت مگر ان دونوں ذریعوں میں زراعت تو ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں انسان ایک خاص قسم کی ترقی کرسکتا ہے۔ اور وہ بھی ایک حد معینہ تک۔ مگر تجارت ایک ایسا عام اور قابل ترقی ذریعہ ہے کہ اس کے سبب سے انسان کو اصناف و انواع کی ترقی حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اور اس کے واسطے کوئی ایسی حد نہیں ہوسکتی جس کے آگے ترقی نا ممکن ہو بلکہ جہاں تک انسان کی عقل کو رسائی ممکن ہے وہاں تک اس کی بھی ترقی ممکن ہے اور وہی ایک ایسی چیز ہے جس میں انسان اپنے ہر طرح کے کمالات اور خوبیاں ظاہر کرسکتا ہے۔ اور وہی تمام صناعیوں دستکاریوں اور ہنرمندیوں کی جڑ ہے۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ ہنوز ہمارے مُلک میں لوگوں کی طبیعتیں اس طرف راغب نہیں ہوئیں۔ بلکہ انھوں نے اپنے حاکم قوم یورپین کی ہمت پر اس قدر اعتماد کر رکھا ہے کہ سب کام اپنی بہتری کے اُنھی کے قبضے میں دے رکھے ہیں۔ حالانکہ ہمارے بھائی ہندوستانیوں کا یہ ایک ایسا غلط خیال ہے۔ جو یقیناً ملکی ترقی

اور قومی اعزاز کو خراب کرنے والا ہے۔ فرض کرو۔ کہ یہی تاجر قوم ہمارے ملک کے ساتھ ایک تاجرانہ تعلق رکھتی ہوتی اور جو تعلق اُس کو ہمارے ساتھ حاکمانہ ہے۔ وہ نہوتا۔ اور جو خیر خواہی اُسکے دل میں صرف اِس وجہ سے ہے کہ ہندوستان اُس کا ملک ہے اور ہندوستان کے باشندے اس کی رعایا ہیں۔ وہ نہوتی۔ تو ہندوستانیوں کی یہ حالت ہندوستان کو کیسی مضرت پہونچاتی۔ اور جو رونق کہ ہندوستان میں اس وقت صرف گورنمنٹ کی توجہ کی بدولت ہے وہ بالکل نیست و نابود ہوتی۔

ہر ملک کو ایک بوستانِ پُر خار کے مانند فرض کیجئے۔ اور اُس کے باشندوں کو خوشنما پودوں کے مثال تصوّر کیجئے۔ پس اگر کسی باغ میں خوشنما پودوں کی جگہ سوکھے درخت ہوں یا اگر ہرے ہوں تو اُن میں کسی قسم کا پھل یا پھول نہو۔ تو کیا ایسا باغ کچھ مفید ہوگا؟ یا اُس کی کچھ قدر و منزلت ہوگی؟ اِسی طرح اگر کسی ملک کے باشندے علم و ہنر یا صنّاعی اور دستکاری سے آراستہ نہوں۔ بلکہ درختِ بے ثمر کے مثل اپنے کمالات سے عاری ہوں۔ تو کیا اُس ملک کی کچھ قدر و منزلت ہوگی یا اُس سے کسی قسم کے نفع کی امید ہوسکیگی ہرگز نہ ہوسکے گی۔

پس ہمارے ہموطنوں کو چاہئے۔ کہ وہ اپنے آپ کو ہر طرح آراستہ کریں اور دنیوی کمالات سے محروم نہ رہیں جن کی مثال ایک بے ثمر درخت کے ساتھ دیجائے۔ اور کمالات دنیوی کے واسطے یقیناً سب سے بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ جو انسان کے دل

کو ہر قسم کے کسب و کمال کی جانب راغب اور مُلکی رونق کو دوچند کر دیتا ہے۔ سیر و سیاحت کی عادت اور آباد مُلکوں کی سیر اور عجائباتِ روزگار کے ملاحظے کی نوبت بلاشبہہ انسان کو تجارت ہی کی بدولت پہونچتی ہے۔ اور انسان کے دل میں عالی حوصلگی کا جوش جس پر تمام ترقیوں کا مدار ہے۔ بلاشبہہ اس تجارت سے پیدا ہوا ہے۔ اور سب سے آخری فائدہ جو اس بے نظیر پیشے کی بدولت انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ تجربہ کاری ہے جس کے بغیر انسان اپنے کسی کام کو استحکام اور مضبوطی کے ساتھ نہیں کرسکتا

پس ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ جب تک ہندوستان کے باشندے اس طرف توجّہ نکریں گے۔ جملہ کمالات میں ناکامل رہیں گے۔

سوالات

۱۔ سب سے زیادہ دُور اندیش۔ اوسط درجے کی۔ اور سب سے گئی گذری قوموں کی تعریف کرو۔؟

۲۔ ہندوستانیوں کا شمار کس قوم میں ہوسکتا ہے۔؟

۳۔ ہندوستانیوں کی موجودہ حالت دیکھکر اُن کے آیندہ کی نسبت کیا خیال کیا جاسکتا ہے۔؟

۴۔ آمدنی کے خاص ذرائع کیا ہیں۔؟

۵۔ اگر انگریزوں کا تعلق ہمارے ساتھ حاکمانہ نہیں بلکہ تاجرانہ ہوتا تو اُسکا نتیجہ کیا ہوتا

۶۔ جس ملک کے باشندے علم و ہنر سے خالی ہوں اُن کے واسطے مصنّف نے کونسی عجیب تمثیل بیان کی ہے۔؟

۷۔ ہمارے ہموطنوں کو کیا کرنا چاہیے۔؟

تجارت کا اثر اخلاق پر

جس طرح بڑے بڑے کامیاب تاجر نوکری کو نہایت حقارت

کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اُس کو ادنٰے درجے کی غلامی اور آزادی
کی برباد کرنے والی سمجھتے ہیں۔ اِسی طرح وہ لوگ جنھوں نے علم
و فضل یا مناصب و خدمات کی وجہ سے امتیاز حاصل کیا ہے بیوپار
اور دوکانداری کو قواے ذہنی اور عقل و اخلاق کے حق میں نہایت
مُضر بتاتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ تجارت میں ہمیشہ وہی لوگ
کامیاب ہوتے ہیں اور ہوئے ہیں جن کے اخلاق درست اور عقل
سلیم ہوتی ہے۔ ایک لائق مصنّف لکھتا ہے کہ تجارت کے برابر
کوئی چیز انسان کے اخلاق کی کسوٹی نہیں ہے۔" ایک عالم جو
محض کتابوں کے مطالعے اور فلسفیانہ استدلال و احتجاج میں
رات دن مصروف رہتا ہے وہ خود نہیں جانتا کہ میں کیا چیز
ہوں اگر وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا اور اپنی عقل اور
اخلاق کی آزمایش کرنا چاہیے۔ تو اُس کو چاہیے کہ بازار میں قدم
رنجہ کرے اُس کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ دانشمند اور
نیک آدمی ہے یا احمق اور شریر النفس۔ اُس کی کامیابی اور
اور ناکامی خود اس کو اپنی حقیقت سے خبردار کردیگی۔ پس جو
قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اُس کے کسی فرد کی نسبت
قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دانشمند اور نیک نہاد ہے
یا احمق اور بد نہاد ہے۔

اگرچہ تاجر ہمیشہ مذہب یا کانشنش کی ہدایت سے اپنے اخلاق
کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی کامیابی اس میں سمجھتا ہے
کہ اُس کی دیانت داری خوش معاملگی اور راستبازی پر لوگونکو

اعتماد ہو۔ لیکن جیساکہ خصائلِ انسانی کا خاصّہ ہے رفتہ رفتہ یہ خصلتیں جو اُس نے بضرورت اختیار کی تھیں اُس کی طبیعت ثانی بنجاتی ہے۔

یہ کہنا کہ تجارت قُواے عقلیہ کے حق میں مُضر ہے واقعہ کے بالکل برخلاف ہے۔ جس قدر تاجر کو اپنی عقل و تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے ایسی کسی اور پیشے والے کو نہیں ہوتی۔ نوکری پیشہ کو اپنی نوکری پر قائم رہنے یا ترقی حاصل کرنے کے لئے صرف اپنے معمولی فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے اور کسان کی کامیابی فقط اُس کی محنت اور بخت اور اتفاق پر موقوف ہے مگر تاجر کو باوجود اُن تمام فرائض کے جو ایک سچّے تاجر کو ادا کرنے ضرور ہیں۔ ہر وقت عقل سے مشورہ لینے اور ایک شطرنج باز کی طرح نت نئی چال چلنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر وقت زمانے کے تیور دیکھتا اور پبلک کے دل ٹٹولتا ہے اکثر اوقات اُسکو فائدہ کثیر کے لالچ میں راستبازی کے خلاف عملدر آمد کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ اس بات کا خوف بھی دامنگیر ہوتا ہے کہ اگر یہ راز کھُل گیا تو اعتبار نہ رہےگا۔ غرضکہ اسی قسم کی بیشمار حالتیں جن میں انسان متردد ہوتا ہے کہ کونسی جانب اختیار کیجائے تاجر کو قدم قدم پر پیش آتی ہیں اور اُس کو عقل و تدبیر سے کام لینے اور کامل غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور اسی طرح تاجر کی عقل معاش روز بروز جلا پاتی جاتی ہے۔ مگر نوکری پیشہ یا کاشتکار کو ایسے مرحلے بہت کم پیش آتے ہیں۔

وہ معمولی قواعد کے شاہع عام پر آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔
نوکری پیشہ اگر اپنے فرائض دیانت اور محنت کے ساتھ انجام دیتا
ہے تو اُس کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں کہ میری وجہ معین
میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی۔ کاشتکار کی کامیابی زیادہ تر آسمانی
مدد پر منحصر ہے جس میں انسانی عقل و تدبیر کو کچھ دخل نہیں۔
اس لئے پہلا عدم ضرورت کے سبب اور دوسرا عدم قدرت کے سبب
عقل اور تدبیر سے بہت کم کام لیتا ہے مگر تاجر خوب جانتا ہے
کہ ذرا چال چوکا اور مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اس لئے اُس کو
پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قوم تجارت
سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اور نوکری کے سوا کسی اور ذریعہ سے
معاش پیدا نہیں کرتی چند نسلوں کے بعد اُن میں تدبیر معاش
کا مادہ باقی نہیں رہتا کیونکہ جس طرح کسی عضو کے معطل و
بیکار رکھنے سے اُس کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور اس میں
سکت باقی نہیں رہتی اُسی طرح قواے ذہنیہ سے جب کچھ کام
لیا نہیں جاتا تو وہ بالکل ازکار رفتہ ہو جاتے ہیں اگرچہ یہ ممکن
ہے کہ اُس قوم میں مستثنیٰ مثالیں ایسے اشخاص کی پائی جائیں
جو اعلےٰ درجہ کی عقلِ معاش رکھتے ہوں لیکن ایسے مستثنیات
سے قاعدہ کلیہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

جس طرح تجارت سے قومی عقل معاش ترقی پاتی ہے۔
اُسی طرح بہت عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتیں صرف تجارت
ہی کے ذریعہ سے تمام قوم میں شایع ہوتی ہیں۔ تجربہ ہی اور

کفایت شعاری جس کے بغیر کسی خاندان بلکہ کسی قوم کا وقار دنیا میں قایم نہیں رہ سکتا صرف تجارت ہی کی بدولت تمام قوم میں سرایت کرتی ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہر ایک قوم میں خواہ وہ قوم تجارت پیشہ ہو اور خواہ نوکری پیشہ کچھ افراد جزرسی اور کفایت شعاری کے ساتھ موصوف پائے جاتے ہوں۔ لیکن ہمارے نزدیک کوئی قوم عام طور پر جزرس اور کفایت شعار نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ عام طور پر اُس میں تجارت شائع نہو۔

جس طرح تجارت سے جزرسی اور کفایت شعاری کی بنیاد تمام قوم میں پڑتی ہے اُسی طرح تحمّل۔ بُردباری۔ نرمی اور موافقت بغیر تجارت کے کسی قوم کی قومی خصلت نہیں بنتی جس طرح سلطنت اور حکومت کا میلان ظلم اور تشدّد اور غرور و نخوت کی جانب ہوتا ہے اُسیطرح تجارت کا اقتضا یہ ہے کہ تُند مزاجوں کو دھیما۔ مغروروں کو خاکسار۔ سخت کلاموں کو شیریں بیان اور جبّاروں کو منکسر المزاج بناتی ہے۔ جو قومیں تجارت پیشہ ہوتی ہیں ایک مدّت کے بعد اُن کی نسلیں فطرتاً اُن خصلتوں پر مجبول پیدا ہوتی ہیں کیونکہ اولاد کے جسمانی اور نفسانی قوے اپنے آبا و اجداد کے جسمانی اور نفسانی قوے کے تابع ہوتے ہیں جس طرح قوی اور تنومند ماں باپ کی اولاد تنومند ہوتی ہے اسی طرح متحمل اور بُردبار ماں باپ کی اولاد مستثنیٰ صورتوں کے سوا ضرور ہے کہ متحمل اور بُردبار ہو۔

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ دنیا میں ابھی تک راستباز تاجروں کی تعداد بمقابلہ جو فروش گندم نماؤں کے بہت

کم ہے۔ لیکن اس سے تجارت کے پاکدامن پر کوئی دھبہ نہیں لگتا۔
جس طرح علم کا خاصہ ہے۔ کہ وہ براہ راست نیکی کی راہ سُجھاتا ہے
لیکن باوجودا اِس کے بہت سے اہل علم اپنی بد اعمالیوں سے علم
کو بدنام کرتے ہیں۔ اسی طرح تجارت براہِ راست آنسٹی اور
راستبازی کی تعلیم دیتی ہے۔ لیکن نالائق تاجر چند روزہ منفعت
کے لئے بددیانتی اور فریب اختیار کرکے تجارت کی پائدار برکتوں
سے محروم رہتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جبتک کسی ملک کی تجارت وہاں کے تعلیم یافتہ
گروہ کے ہاتھ میں نہیں آتی بلکہ جاہلوں اور نالایقوں کے پنجہ میں
پھنسی رہتی ہے تب تک تجارت کی کامیابی کا بھید عام نظروں
سے مخفی رہتا ہے اکثر نفع یا نقصان کو اُمورات تقدیری میں شمار
کرتے ہیں جن میں انسان کی عقل و تدبیر کچھ کام نہیں دیسکتی
حالانکہ وہ تدبیر سے ایک دم غافل نہیں رہتے۔

اصلی جرأت اور دلیری بھی جیسی تجارت کی بدولت انسان میں
پیدا ہوتی ہے ایسی کسی اور پیشے کے ذریعے سے نہیں ہوتی شاید وہ
لوگ جو تجارت اور دلیری میں منافات سمجھتے ہیں اِس بات کو سنکر
متعجب ہوں مگر اُن کو یاد رکھنا چاہیے کہ دلیری یا بُزدلی کسی خاص
فرقہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کہ ایک سپاہی یا
سپہ سالار نہایت بُزدل ہو اور ایک بیوپاری بہت بڑا بہادر ہو
جس طرح بہادروں کو میدانِ جنگ میں دلیری اور شجاعت کے
کام کرنے پڑتے ہیں۔ اِسی طرح ہر شخص کو اپنی روزانہ زندگی میں

اکثر موقعوں پر دلیری سے کام کرنے پڑتے ہیں۔

الغرض تجارت کی کامیابی کے لئے جس کا مدار تاجر کے مقبول و معتمد خاص و عام ہونے پر ہے۔ نہایت ضرور ہے کہ تاجر علاوہ عاقل اور مدبر ہونے کے عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتوں سے آراستہ ہو اور اس لئے تجارت کو انسان کا معلم اور اتالیق کہا جاوے تو کچھ بیجا نہیں

لڑائی جو انسان کی خونریز دشمن اور ملکوں کی غارت کرنے والی دیوی ہے اور جو اب بھی ویسی ہی مُہیب اور ہولناک ہے جیسی یونان کے مشہور شاعر ہومر کے زمانے میں تھی۔ اور کبھی اس کی تیغ خوں آشام ہمیشہ کے لئے میان میں کیجائے گی تو تجارت ہی کی بدولت کی جائے گی تجارت نے دنیا میں شایستگی کو پھیلایا ہے اسی نے تمام رُوے زمین پر انسان کی ضرورت اور آسایش کے سامان برابر تقسیم کئے ہیں۔ اُس نے علوم و فنون کی بیش قیمت اور مفید تحقیقاتوں اور ایجادوں کو رواج دیا ہے اور اُس نے موجدوں کی طبیعت میں نئی نئی ایجاد و اختراع کی تحریک پیدا کی ہے وہ علم اور دین کی اشاعت میں مدد دیتی ہے اور وہ اور ترقی ہمیشہ لازم و ملزوم رہی ہیں۔

انسان کی اندرونی قوے کی ترقی۔ علم و فنون کی ترقی جنرل انفورمیشن کی ترقی۔ اخلاق کی ترقی۔ ضوابط و قوانین کی ترقی۔ آزادی کی ترقی غرضکہ ہر طرح کی ترقی ہی ترقی اُس سے پیدا ہوئی ہے اُسی نے ہمیشہ جس چیز کو جس درجہ پر پایا ہے۔ اُس سے جدا ہوتے وقت اُس کو بلند تر سیڑھی پر چھوڑا ہے۔ وہ اول ایک

ملک سے دوسرے ملک میں شایستگی کے لئے بطور طلایہ کے جاکر راستہ طیار کرتی ہے - اور پھر شایستگی کو اپنے ساتھ لیکر وہاں پہونچتی ہے - اُس نے وحشیوں کو انسان بنایا ہے اور اس نے عوام الناس اور اُمرا کو بادشاہی تک پہونچایا ہے - اُسی نے موروں کو اپنے عہد میں دنیا کا عقلمند بنایا تھا اور اُسی نے انگریزوں کو اکیلا بلا شرکت غیر تمام ہندوستان کا وارث ٹھہرایا -

سوالات

۱- تاجروں اور ملازموں میں ایک دوسرے کے کام پر اعتراض کرنے کے کیا اسباب ہیں - ؟
۲- اخلاق کی کسوٹی سے کیا مراد ہے - ؟
۳- جو قوم تجارت نہیں کرتی ہے اُس کے کسی فرد کی نسبت قطعی رائے قائم کرنا کیوں دشوار ہے - ؟
۴- تاجر کا اخلاق کیوں درست ہو جاتا ہے - ؟
۵- ثابت کرو کہ تجارت قواے عقلیہ کے حق میں مُضر نہیں ہے - ؟
۶- نوکری پیشہ یا کاشتکار کے فرائض تاجر کی بہ نسبت کیوں سیدھے سادے خیال کئے جاتے ہیں - ؟
۷- ثابت کرو کہ اگر قواے ذہنیہ سے کچھ کام نہ لیا جاے تو وہ بیکار اور معطل ہو جاتے ہیں ؟
۸- ثابت کرو کہ کفایت شعاری تجارت کرنے سے انسان میں جلد پیدا ہو سکتی ہے - ؟
۹- اگر بعض تاجر بددیانتی کرتے ہوں تو تجارت کو بُرا کہنا کیوں نا درست ہے - ؟
۱۰- اصلی جرأت اور دلیری تجارت سے کس طرح پیدا ہو سکتی ہے - ؟
۱۱- ہومر شاعر نے لڑائی کی نسبت کیا لکھا ہے - ؟
۱۲- تجارت سے کن کن باتوں میں ترقی ہوتی ہے - ؟

آنے والی گھڑی

اے آنے والی گھڑی ! ہم بیان نہیں کرسکتے کہ تجھ میں کیسی کیسی

دلچسپیاں اور کیا کیا مزے ہیں تیرے دامن میں ہم اپنی ہزارہا آرزوں
کو پالتے ہیں۔ اور اپنے لاکھوں ارمانوں کو تیری ہی آغوش میں
تھپک تھپک کے سُلا دیتے ہیں۔ تو ہر بیکس و حرمان نصیب کا سہارا
اور ہر شکستہ پا کے ہاتھ کا عصا ہے۔ تو ایک عجیب جادو بھری اور
اور طلسمی دُوربین ہے جس میں ہر شخص اپنے مذاق اور اپنے مطلب
کی خبریں دیکھ لیتا ہے۔ حرمان نصیب اپنی معشوقۂ ناز آفریں کا چہرۂ
زیبا۔ لاولد اپنے ہونے والے بچے کی جیتی جاگتی مورت بیوہ
مایوسی ہی کے دامن میں طرح طرح کی دلچسپیاں۔ یتیم اپنی حسرتناک
زندگی میں ہر قسم کی ترقیاں خانہ نشین دنیا کے دلچسپ اور
خوش سواد شہر۔ اور وطن آوارہ بال بچوں اور یارانِ وطن کی
صورتیں۔ غرض کون ہے جسے آنے والی گھڑی میں اپنی تمنّائیں
اور آرزوئیں اصلی حالت میں نہیں نظر آ جاتیں۔

جو گھڑی گذر گئی وہ ہاتھ سے جا چکی۔ اُس کا ذکر ہی کیا ہے
اور ہم سے تضیع اوقات کرنے والے اوبار نصیب اپنا عیب چھپانے
بلکہ اپنے سر سے الزام کی بلا ٹالنے کے لیے۔ یہی کہیں گے کہ "افسوس
وغا دیگئے"۔ موجودہ گھڑی کی ہمیں قدر نہیں۔ اِس کی قدر تو کچھ
وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو فی الحال ترقی کر رہے ہیں۔ جن
لوگوں کا سرمایۂ ناز صرف گذشتہ نسل کی ترقیاں اور بزرگوں کے
کار نامے ہوں اُنھیں موجودہ گھڑی اور اُس وقت سے کیا
سروکار جو گذر رہا ہے۔ اور ہمیں کس موجودہ نعمت اور کس
ہم صحبت دوست کی قدر ہے جو اس کی ہوگی۔ لہذا ہماری ساری

اُمیدیں تو اُسی آنے والی گھڑی کے دَم سے قائم ہیں۔ہم اُس آنے والی گھڑی میں اچھی اچھی آرزوئں۔ مزے مزے کی تمناؤں خوشگوار لطفوں۔ اور دل خوش کن کامیابیوں کے منصوبے باندھتے ہیں۔ جب ناکامیابیاں ہمارے دل کو ستاتی ہیں اور مایوسیوں کا چاروں طرف ہجوم ہوتا ہے اُس وقت یہ آنے والی گھڑی دُور ہی سے ہمیں ایسی ایسی ترقیوں اور کامیابیوں کی دلفریب صورتیں دکھاتی ہیں کہ ہم محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ اور جب ہمارے گوشِ دل میں اُس کی یہ الہام کی ایسی اطمینان بخش صدا آتی ہے کہ سب تیرے لئے ہیں تو پھر ہمیں نہ کوئی صدمہ یاد رہتا ہے اور نہ کوئی رنج و الم۔ ہماری اُس پُر مصیبت زندگی کو صرف یہی چیز گوارا بلکہ خوشگوار بنائے ہوئے ہے کہ زندگی کے آنے والے میدان میں اور اُس کے اُن مرغزاروں میں جن میں ابھی ہمارا گذر نہیں ہوا ہے ہم عجب جوش و مسرّت سے اُن خوشیوں اور دلچسپیوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ جن میں اُمید دُور سے دکھا دکھا کے ہماری دلفریبی و دلربائی کیا کرتی ہے۔ اور اسی کی برکت ہے کہ سامنے کا ہر منظر جو دُھندلکے کے دامن کے اندر سے ہٹتا ہٹتا نظر آتا ہے ہمیں اُن عام مناظر سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے جنھیں ہم طے کر چکے ہیں۔ اور اسی شان سے ہر وہ خیالی تصویر بھی زیادہ دلربا اور نظر فریب دکھائی دیتی ہے جسے واہمہ ہم سے دُور ہٹا کے بعد مسافت کی تیرگی کے دامن پر بنا دیتا ہے۔

واقعی وہ عجیب فرشتہ رحمت ہے جو ہماری محوِ حیرت آنکھوں کو

اُس سامنے کی آنے والی فضا میں لیجاتا اور اُن میں یہ قوت پیدا کردیتا ہے کہ استقبال کے تیرہ گوں دامن کو چاک کردیتا ہے تاکہ اُن دلربا صورتوں کو دیکھ لیں جو اور کسی جگہ نہیں نظر آتیں مگر اس سے بڑھ کے عجیب وہ فرشتہ غضب ہے جو موجودہ گھڑی پر متصرف ہے۔ حقیقت میں یہ کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہی آنے والی گھڑی جب پاس آ پہونچتی ہے اور موجودہ گھڑی بنجاتی ہے تو نہ کہیں وہ دلچسپیاں ہوتی ہیں نہ وہ دلفریبیاں۔ نہ اُن آرزوں کا پتہ لگتا ہے جنھیں ہم نے اُس آنے والی گھڑی کی گود میں تھپک تھپک کے سُلایا تھا اور نہ اُن ارمانوں کا جو اُس کے دامن میں پل رہی تھیں۔

آہ کیا قیامت ہے کہ ہم دل میں جو جو منصوبے باندھتے ہیں اور جن جن ہوسوں کو تیرے دامن سے وابستہ سمجھتے ہیں جب تو ہمارے پاس آ پہونچتی ہے تو وہ سب ایک خواب و خیال کی طرح ہوجاتے ہیں ہم اپنے دل سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ آنے والی گھڑی میں یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ اِس اِس طرح پسینہ بہاکے کوشش کریں گے۔ اور یوں جان توڑ توڑ محنت و مشقت کریں گے مگر ادھر تو آئی اور ہم اُس سارے عہد و پیمان کو بھول گئے۔ اور جس طرح تمام موجودہ گھڑیوں کو پڑے ہی پڑے کاہلی و غفلت سے کھودیا کرتے ہیں۔ تجھے بھی کھودیا۔ سچ بتا۔ تو وہ دلدار ناز آفریں تو نہیں جسکا وصل نصیب ہوتے ہی ہم اپنی ساری شکایتیں اور دل کے تمام

منصوبے بھول جایا کرتے ہیں۔ تو وہ پری وش تو نہیں جس کا ایک جلوہ ہوش رُبا ساری آرزوؤں اور ارمانوں کو بُھلا دیا کرتا ہے نہیں ایسا نہیں ہے۔ وصالِ یار میں تو مسرت و کامیابی کی محویت پرانی آرزوؤں کو بھلاتی ہے۔ اور تو جب پاس آکے پہونچتی ہے، تو بجائے خوشیوں اور مسرتوں کے ہر طرح کی مصیبتوں اور ہر قسم کی فکروں کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔

افسوس۔ آنیوالی گھڑی میں، واقعی اور حقیقی کامیابیوں کا جلوہ دیکھنے کے علاوہ ہم نے کیسے کیسے خیالی کرشمے دیکھ پائے تھے اس آئندہ کی زمین پر ہم نے اپنے خیال کی طبع آزمائی سے کیسی کیسی عالیشان عمارتیں قائم کی تھیں۔ کیسے کیسے دلچسپ اور رُوح افزا باغ لگائے تھے۔ جن میں تیرے دامن تک اپنا ہاتھ پہونچنے کے بعد دیکھا تو وہ تمام عمارتیں منہدم تھیں اور وہ چمن شدّاد کی جنّت کی طرح نظروں سے غائب تھے۔ آہ کیا کسی اور کو بھی یا ہمیں کسی اور حالت میں اتنا بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ مگر نہیں اے آنیوالی گھڑی جتنی تو اپنی آیندگی کی حالت میں مہربان و شفیق تھی اتنی ہی موجودگی کی حالت میں تو ظالم و نا خدا ترس ہے۔

ہم زمانے کی تیز رَو گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کی بہار دکھاتی ہوئی ہمیں عرصۂ ہستی سے نکال لیجاتی ہے۔ آنیوالی چیزوں کے دیکھنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ پیچھے پھر کے دیکھتے نہیں۔ موجودہ گھڑی پر تیز رَوی کے

سبب سے نظر نہیں آتی - آنیوالی فضا میں طرح طرح کی زندگی بخش سبزہ زار اور عجیب قسم کے لہلہاتے ہوے کھیت ہیں - امیدیں یقین دلا رہی ہیں کہ اُن مرغزاروں میں پہونچ کے ہم اپنی روح تر و تازہ کریں گے اور اُن کھیتوں سے اپنے حوصلے کے تھیلیاں اور اپنی ہوس کے کھتے بھر لیں گے مگر قریب آتے ہی وہ مرغزار اور کھیت کچھ ایسا بہروپ بدل کے اپنی دلفریب صورت اس قدر بگاڑ کے اپنی صورتوں پر کچھ ایسا بدمزہ برقع ڈال کے اور اس عجلت و تیزی سے نکلجاتے ہیں کہ ہم دیکھتے رہجاتے ہیں - پاس سے گذرتے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہوتا - بلکہ ہم تو یہ سمجھیں گے کہ ہماری بدقسمتی سے یہ گاڑی ہی ہماری تمام آیندہ خوشیوں اور مسرتوں کو کچلتی اور پیستی ہوئی نکل جاتی ہے

کیا اچھا ہوتا اگر اسے آنیوالی گھڑی تو ہمیشہ آنیوالی ہی رہتی - کبھی نہ آ پہنچتی - عمر رواں کی گاڑی کسی ایک ہی جگہ پر کھڑی رہجاتی اور ہم موجودہ حالت سے قطع نظر کرکے جن میں تکلیفوں اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہیں - آنیوالی آرزوں اور امیدوں کا خواب ہی دیکھا کرتے -

(شرر لکھنوی)

سوالات

۱ - مصنف نے آنیوالی گھڑی کو کن کن ناموں سے یاد کیا ہے - ؟

۲ - وقت کی نہر کون لوگ کر رہے ہیں ؟ اور ہم لوگ آنے علیحدہ کیوں خیال کئے جاتے ہیں - ؟

۳ - ماضی کے عالم میں ہمکو کیا چیز خوش رکھتی ہے - ؟

۴ - ہمکو کس کس طرح سے کن باتوں کی کیا کیا امیدیں ہوتی ہیں اور انکا انجام

کیا ہوتا ہے۔؟
۵۔خوشبوؤں اور مرسلیوں کے بجائے سبیتوں اور فکروں کو کون لے آتا ہے۔؟
۶۔مصنف نے خیالی باغ اور عمارتوں سے کیا مراد لی ہے۔؟
۷۔ہم آیندہ کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں اور اس کی اصلیت کیا ہوا کرتی ہے۔؟
۸۔اگر آیندہ کا وقت کبھی نہ آتا تو کیا نتیجہ ہوتا۔؟

صبح

یہ دلفریب گھڑی علی العموم پسند کی جاتی ہے۔ اور واقعی عجیب سہانا وقت ہوتا ہے جبکہ ہر ایک کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر کوشش میں ایک تازگی ہوتی ہے۔ جذباتِ دل بر انگیختہ ہو جاتے ہیں۔ اور ہر شخص سچے دل سے اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ اس وقت شیخ و برہمن دونوں کی عبادت میں خاص اور اثر پیدا ہوتا ہے۔ کھیت جوتنے والا ہرواہا جتنا کام اس وقت کی دلو گھڑیوں میں کرلیتا ہے دن بھر میں نہیں کرسکتا شاعر جیسی خیال آفرینی اسوقت کرسکتا ہے اور کسی وقت ممکن نہیں۔ مسافرسے جیسی سریع السیری اس نور کی گھڑی میں ظاہر ہوتی ہے اور وقت دشوار ہے۔

اس وقت کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔ تو عجیب عجیب متضاد کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ یوں تو زاہد کی نماز۔ برہمنوں کی پوجا مسافروں کے راہِ طلب میں قدم رکھنے۔ سب میں نمایاں فرق اور ایک خاص کیفیت ہے۔ اور جہاں دیکھو ایک نیا سماں نظر آئے گا۔ مگر اس گھڑی کی بعض حالتیں بہت ہی

ممتاز اور دل پر اثر ڈالنے والی ہیں۔

صبح کی اصلی حیثیتیں دو ہی ہیں۔ رات کا ختم ہونا۔ اوردن کا برآمد ہونا پہلی حیثیت سے اس پر کسی گزشتہ کیفیت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دوسری حیثیت سے ایک خاص زندگی کا آغاز۔ اور دونوں میں خوشی و غم اور راحت و الم کے دونو پہلو موجود ہیں۔ صبح و شام کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ ان اوقات میں دو وقت ملتے ہیں۔ ہاں ملتے تو ضرور ہیں مگر اس کو ماننا نہ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ رخصت ہونے کے لئے ملتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ مگر کبھی آنے والا ایسا محبوب ہوتا ہے کہ جانے والے کی مصیبت سے نجات پانے اور آنے والے کے وصل سے لطف اٹھانے کی خوشی ہوتی ہے۔ اور کبھی جانے والا ایسا عزیز ہوتا ہے کہ اس سے چھوٹنے اور فراق کی ظالم گھڑی سے سابقہ پڑنے کا غم ہوتا ہے وہ بھی صبح ہے جبکہ شبِ گزشتہ کے عیش و طرب کا خاتمہ ہوتا ہے وہ بھی صبح ہے۔ جب رات بھر کے غم و الم کی بیقراری کا خاتمہ ہوتا ہے اور آفتاب اپنی امید بھری صورت دکھا کے دل میں آرزوں کا چراغ روشن کرتا ہے۔ مگر ان دونوں صبحوں سے زیادہ تر متاثر شعراء ہوتے ہیں یا عشاق شیدا۔ لیکن کاروباری دنیا کی صبح دوسری ہی صبح ہے۔ اسے ان صبحوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہاں نہ شبِ فراق ہے نہ شبِ وصال۔ ~~رنج~~ راحت دنیا میں توام ہیں۔ اور ان کو سب ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔ مگر صبح نہ ان کے رنج کو بڑھاتی ہے نہ اُنکے

غم کو بلکہ غور سے دیکھو تو اُن کی صبح ہمیشہ امید و آرزو کی صبح ہوتی ہے۔ ہاں اس عالم میں بھی اُن کی آنکھ کھلتے ہی رنج والم اور درد و غم سے دوچار ہو جاتے ہوں۔ مگر اکثر بلکہ تقریباً سبھی کے لئے تازہ امیدیں لیکے آتی ہے۔ اور اُن کے امید اور آرزو سے بھرے ہوئے چہرے اُس وقت چمکنے لگتے ہیں۔ اور رات کی تیرگی دور ہونے کے بعد کون ہے جس کے چہرے پر صبح کا آفتاب اُمید کا سُنہرا غازہ نہ مل دیتا ہو۔

اس وقت کا آرزو بھرا سین تو ذرا دیکھو کہ کس قدر دلچسپ ہے صبح کے تارے نے جگمگا کے اپنی نیم باز مستانہ آنکھوں کے اشاروں سے شیخ و برہمن دونوں کو جگا دیا ہے۔ عالم پر سے رات کا موت کا سناٹا دُور ہوا ہے۔ اور مُرغِ سحر کے ساتھ موذن نے اذان دی۔ برہمن نے صداے ناقوس بلند کی۔ اور کلیسا والے نے گھنٹہ بجایا۔ ان سب کے ساتھ مرغانِ سحر بھی دلچسپ نغموں سے اپنی بیداری کا ثبوت دینے لگے۔ سب لوگ بستر سے خوش و خرّم ہنستے کھلکھلاتے اُٹھے اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔

سب سے پہلے کسان اپنے بیلوں کو کھول کے اور ہل کندھوں پر رکھکے کھیتوں کی طرف چلا۔ کارخانوں میں صبح کی سیٹی بجی اور مزدوروں کا غول خوش خوش بڑی بڑی فیکٹریوں کی طرف روانہ ہوئے اور ہر شخص اپنے کام سے لگا۔ گویا عالم کی مشین جو کچھ رات گئے بگڑ گئی تھی اور ساری رات بند پڑی رہی تھی پھر چلنا

شروع ہوئی۔ صبح کی خوشخرام نسیم لہلہاتی ہوئی کھیتوں کو لہرا رہی
ہے۔ جنکا حسن اس وقت بہار پر ہے۔ اور جن کی بہار نظروں میں
کھپی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ پُرلطف نظارہ اُن کمسن بچوں اور
نوعمر لڑکوں کا ہے جو گھروں سے نکل نکل کر کھیلتے کودتے اسکولوں
کی طرف چلے ہیں۔ یہ زمین کی سب سے زیادہ قیمتی پیداوار ہیں۔ اور
انھیں کے دم سے زمانے کی آیندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ ہماری آرزوئیں
ان کے تروتازہ اور بشاش چہروں سے نمایاں ہیں۔

ان کے تمام چیزوں کو دیکھ کے کون ہے جس کی مُردہ اُمیدیں
بھی زندہ ہوجاتی ہوں۔ اور جس کے دل میں ذرا بھی اس کا خوف
باقی رہتا ہو۔ اسی سے ثبوت ملتا ہے کہ دنیا فی نفسہ خوشیوں اور
امیدوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور ہر چیز ہم سے کامیابی اور مقصدوں کی
کا وعدہ کرتی ہے۔ ان باتوں کو کارکنانِ قدرت ہر صبح کو نہایت
وضاحت سے آشکارا کردیا کرتے ہیں۔ لہذا صبح کامیابی و مقصدوں کی
ہی سے بھری ہوئی ہے۔ رہا یہ جو بعض لوگ شاکی نظر آتے ہیں
وہ انکا ذاتی نقص ہے۔ صبح تو بُری نہیں ہے۔ لیکن ہاں انسان
کو اختیار ہے کہ اپنی صبح بُری بنالے یا بھلی۔ (شرر لکھنوی)

سوالات

۱۔ صبح کے وقت کون کون لوگ کیا کیا کام کرسکتے ہیں۔؟
۲۔ صبح کی اصلی حیثیتیں کیا ہیں، اور اُن کے آثار کیا کیا ہیں۔؟
۳۔ صبح کی آرزو بھری سین کی حالت بیان کرو۔؟
۴۔ عالم کی مشین جو رات بھر بند پڑی رہتی ہے صبح کو وہ کس طرح کھلتی ہے۔؟
۵۔ ثابت کرو کہ دنیا خوشیوں اور امیدوں سے بھری پڑی ہے۔؟

تدبیر اور امید

یہ عام اور غیر متبدل قاعدہ قدرت کے قانون کا ہر ایک چیز کے ہونے کے لئے اُس سے پہلے اُن چیزوں کا ہونا ضرور ہے جو اُس کے ہونے کے لئے ایک ضروری سبب ہیں ایسا ہے کہ کوئی چیز مادّی ہو یا غیر مادّی - خارجی ہو یا ذہنی اُس سے مستثنےٰ نہیں جتنی چیزیں ہماری آنکھ کے سامنے آتی ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اُن چیزوں کے بغیر ہوگئی ہو جو اُس کے ہونے کے لئے قدرتاً مقدّم ہیں۔ جتنے خیالات ہمارے ذہن میں گذرتے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے پہلے وہ باتیں ہمارے ذہن میں نہ آجاتی ہوں جو اُس خیال کے پیدا ہونے سے پہلے عادتاً ضروری ہیں۔ جتنی چیزیں ہیں اُنہیں قدرت نے باہم ایسا تسلسل اور ارتباط رکھا ہے کہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری پیدا ہوتی ہے۔ پس ہر چیز کے حاصل کرنے کے لئے اُن چیزوں کا پہلے مہیّا کرنا جو اُس کے لئے بطور آلات اور معدات اور مقدمات کے ہیں تدبیر ہے اور اُنکے مہیّا کرنے پر اُس چیز کے حاصل ہونے کی توقع کرنا امید ہے اور بغیر اسباب کے کسی چیز کے پیدا ہونے کا خیال کرنا جنون و نادانی ہے۔ اور بلا مہیا کرنے اُن اسباب کے اُس شے کے حاصل ہونے کی توقع کرنا حماقت ہے۔ اور جو چیزیں کسی چیز کے ہونے کی اصلی سبب نہوں اُن سے اُس شے کے ہونے کی

توقع کرنا تدبیر کی غلطی ہے۔

یہ بات جو ہم نے بیان کی اُسے نادان سے لیکر کامل حکیم تک۔ اور جاہل سے لیکر عارف باللہ تک۔ اور ملحد سے لیکر شارع تک سب نے تسلیم کیا ہے اور سب مانتے چلے آئے ہیں اور ہم سب ہر وقت اور ہر لحظہ ہر چیز میں اِس قاعدے کا برتاؤ دیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم اسے ایک صاف اور روشن مثال میں سمجھاتے ہیں۔ دیکھو۔ ایک دہقان غلّہ پیدا کرنے کے لئے کیا کرتا ہے۔ اور اُسے غلّہ حاصل کرنے سے پہلے۔ کس کس چیز کا مہیّا کرنا ضرور ہوتا ہے۔ پہلے وہ اچھی زمین تلاش کرتا ہے جس میں زراعت کی قابلیت ہو۔ پھر وہ اُن آلات کو جمع کرتا ہے جن کی زمین بنانے کیلئے ضرورت ہے۔ پھر وہ اُن آلات کو کام میں لاتا ہے اور جو خود رَو گھاس یا پُرانی کھیتی کی بیکار اور نکمّی چیزیں اُس میں پڑی رہ جاتی ہیں اُن کو صاف کرکے زمین کو اصلی ہیئت پر لاکر اُسے بناتا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ کس جنس کی اُس وقت ضرورت ہے تاکہ لوگوں کی حاجت رفع ہو اور مجھے قیمت ملے۔ آخر وہ مختلف جنسوں میں سے ایک یا چند چیزوں کو اختیار کرکے اُسکا عمدہ بیج ڈھونڈھتا ہے۔ اور مختلف دوکانوں۔ مختلف بازاروں میں خود پھر پھر کر اُسے تلاش کرتا ہے اور اپنے نزدیک وہ ایسا بیج جو نہ سڑا ہو نہ گلا نہ بوسیدہ ہو نہ ناقص۔ سوائی قیمت دیکر لیتا ہے۔ پھر اُسے ایک اندازۂ معیّن سے زمین میں ڈالتا ہے۔ پھر اُسے مٹی میں ملاکر چھپا دیتا ہے۔ پھر اُگنے کے بعد

وقتاً فوقتاً پانی دیتا ہے اور جو خود رو گھانس پیدا ہو جاتی ہے اُسے
دُور کرتا رہتا ہے۔ پھر جب اُن تدبیروں کے کرنے کے بعد اُسکی
کھیتی ارضی و سماوی آفات سے محفوظ رہی اور اُن باتوں سے جو
اُس کے اختیار سے خارج ہیں خدا نے اُس کی زراعت کو بچایا۔
تب وہ ایک دانے کے سَو سَو اور ہزار ہزار حاصل کرتا ہے اور
اپنی محنت اور تدبیر کا ثمرہ پاتا ہے۔

پس ان سب چیزوں کا مہیّا کرنا اور اِس تسلسل اور
ارتباط اور ترتیب کا لحاظ رکھنا تدبیر ہے اور بعد اس کے پھل
پانے کی توقع کرنا سچّی امید ہے۔ اور ان میں سے کسی چیز کو چھوڑ
دینا یا کسی ترتیب اور ارتباط میں چوک جانا یا کسی امر کی تقدیم
و تاخیر کا لحاظ نکرنا۔ یا وقت پر کسی چیز کو استعمال میں نہ لاتا
تدبیر کی غلطی ہے اور کسی چیز کا باوجود سعی کے نہ ملنا یا کسی اتفاقی
امر کا پیش آجانا یا کسی ارضی و سماوی آفت سے اُس زراعت
کا خراب ہو جانا تقدیر کی مخالفت ہے۔
(نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں بہادر)

سوالات

۱۔ قدرت کے قانون کا غیر متبدل قاعدہ کیا ہے۔؟
۲۔ دہقان کو غلہ پیدا کرنے کے لئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔؟
۳۔ دنیا میں سچّی امید کیا ہے؟

گلشن امید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا
کی ہیں۔ مگر یہ زمین جس قدر تخمِ امید کو پرورش کرتی ہے۔ اس

کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اور اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کرتی ہیں۔ یا بمقتضائے سن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر امید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تیز ہونے لگی۔ کہ حالت موجودہ ہماری کچھ خوش حال یا بد حال بھی ہوسکتی ہے۔ اسی وقت سے اسکی تاثیر شروع ہوجاتی ہے امید ایک رفیق ہمدم ہے۔ کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دمبدم دلوں کو بڑھاتا ہے۔ اور سینے کو پھیلاتا ہے خیالات کو وسعت دیتا ہے۔ اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوشحالی کا باغ پیش نظر رہتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو۔ یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہوجائیں پھر بھی یہ جادو نگار مصور ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے۔ جسے دیکھکر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہوجائے گی۔ تو ساری ہوسیں پوری ہوجائیں گی۔ اور پھر سب آرزوں سے جی سیر ہوجائیگا۔

اس میں بھی شک نہیں کہ امید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی بیماری۔ قید۔ مسافرت۔ بہت سے دنیا کے دکھ درد ہیں اگر امید نہو۔ تو ہرگز نہ جھیلے جائیں۔ آسا جیے۔ نراسا مرے۔ یہ نعمت جو بظاہر ہر کس و ناکس میں عام ہو رہی ہے۔ وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہمکو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کرسکتی۔ کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے

زندگی کے بھلاوے ہیں۔ اور اُنکا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے۔
تو ایک دم گذارنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال ہونے لگے۔ بہت
ایک دم بھی ہمکو جینا ہجر میں تھا ناگوار پر امید وصل پر برسوں گوارا ہو گیا
اِس میں شک نہیں۔ کہ اُمید دُھوکے بہت دیتی ہے۔ اور اُن
باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے۔ جو انسان کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔
مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزا دیتے ہیں۔ اور موہوم
وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما
معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملے میں ناکام بھی کرتی ہے۔ تو
اُسے ناکامی نہیں کہتے بلکہ قسمت کی دیر کہکر ایک اِس سے
بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے۔
میں ایک رات اِن ہی خیالات میں حیران تھا۔ اور سوچ
رہا تھا۔ کہ انسان کے دل میں شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا
ہے۔ جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے۔ اور زمانۂ آئندہ
پر رنگ آمیزیاں چڑھاکر خود اپنے لیے امید و بیم اور نفع
و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے۔ یکایک آنکھ لگ گئی
دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں۔ جس کی وسعت
کی انتہا نہیں۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے آس پاس
سے لیکر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین و شاداب
ہے۔ ہر چمن رنگ و رُوپ کی دھوپ سے چمکتا۔ خوشبو سے
مہکتا۔ ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصل بہار کی طرح
گلہائے گوناگوں سے بُو قلموں ہو رہی ہے۔ اور رنگا رنگ

کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھکر دل پہ ایک عالم طاری ہوا۔ کہ سرتاپا محو ہوگیا۔ جب ذرا ہوش آیا۔ تو اُن چمن ہائے دلکشا کو نظر غور سے دیکھنے لگا۔ اور ایسا معلوم ہوا۔ کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو۔

پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دُور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اونچے درخت جُھنڈ کے جُھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سُنائی دیتے تھے۔ یہاں خوب زور و شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں۔ اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سے جو نظر اُٹھائی۔ تو اور ہی طلسمات نظر آیا۔ یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں اُن کے تیار میوے زمین کو چُوم رہے ہیں۔ اِس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا۔ چنانچہ قدم اُٹھایا مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔ زیادہ حیران ہوتا گیا کیونکہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی۔ پاس پہونچکر اُس کی رنگت پھیکی پڑگئی۔ اور میوے تو گر ہی چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں۔ وہ آگے آگے اُڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پُھرتی سے پہونچا تھا۔ اور جو بہاریں تھیں۔ وہ بھی ہر قدم پر سامنے ہی تھیں۔ مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں۔ گویا میرے شوق آرزو کو دُھتکاتی تھیں۔ کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا۔ وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دمبدم غمگین ہوتے ہوتے دق ہو گیا تھا۔ مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا۔ کہ چپکے چلو۔ جو نعمتیں ڈھکا رہی ہیں۔ کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آئیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جگھٹا نظر آیا۔ کہ جس میں زن و مرد خرد و کلاں بہت آدمی اُچھلتے کودتے چلے جاتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں۔ یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے مُنہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا۔ اور ایک ایک آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہر ایک کی خوشی کچھ خاص قسم کی ہے۔ کہ وہ اُسی کے دل میں ہے۔ سب کے سب چلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا۔ نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا۔ بہت لوگوں کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اگر کوئی شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو۔ تو انھیں اُس کے بجھانے کی فرصت نہیں۔ اس واسطے اُن کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا کیا۔ ایک بڈھا نظر آیا۔ کہ باوجود بڑھاپے کے ان ہی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا۔ مگر کچھ ہو نہ سکتا تھا میں نے خیال کیا۔ کہ بڈھے کو اب کیا ہوس ہوگی۔ اسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ اسے سلام کیا۔ بڈھے نے تیوری بدل کر منھ پھیر لیا۔ اور کہا صاحب دق نہ کیجئے۔ آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے

تھے وہ وقت آن پہونچا ہے۔ اب ایک عہد آتا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہوجائے گا۔ افلاس زدہ اور طالب روزگار بیچارے ٹیکس اور محصولوں کے مارے آئے دن کی جانکنی سے خلاص ہوجائیں گے۔ بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں۔ وہ بھی بازو ڈالکر آرام سے بیٹھ جائیں گے۔

میں نے بڈھے کو اس کی خشکی دماغ کے حوالے کیا۔ اور وہیں ٹھہر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا۔ جس کی ملائمت شکل اور آہستگی رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید کچھ اخلاق سے پیش آئے۔ مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے جھک کر ایک سلام کیا۔ اور کہا اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا۔ مگر اب تو اس خوشی کا ہوش نہیں۔ کیونکہ بیس برس سے میں ایک عہدے کی امیدواری کر رہا تھا۔ اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بھی چھوڑا۔ اور ایک اور کو جالیا وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا۔ کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے۔ کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دیکھا۔ کہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی۔ اس کے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا۔ یعنی اگر کچھ اور نہو۔ تو ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے۔ اور ٹھہر جاتا ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے

اور سرکارِ عالم سے انعام کا امیدوار ہے۔

جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں۔ تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بیحاصل ہے۔ اب جو اپنی آنکھ کہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور آپ دیکھو کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا وہ آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے اُسے دیکھکر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اُسے بھی ٹٹولنا چاہیے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اسے بھی سنایا۔ وہ ہنسا اور کہا۔ صاحب! جہاں آپ کھڑے ہیں۔ یہ ملکۂ امید کا باغ ہے۔ وہ ملکۂ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو۔ بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس تحفے لیے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور و شور مچاتے دیکھا۔ یہ انہی کے اشاروں پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔

آنکھ اُٹھا کے دیکھوں۔ تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالی شان ہے۔ اور اُس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزارِ جوانی عین بہار پر ہے۔ سر تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اُس کے زیرِ لب پارے کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر۔ تاج مرصع۔ موتیوں کے ہار۔ خلعت زرنگار کشتیوں میں چنے ہوئے آگے دھرے ہیں۔ قسمت و نصیب جہاں کی نعمتیں سجائے اُس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں اور بہار زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے۔ عیش مدام اور فرحت دوام سے چہرہ روشن ہے اُس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اُس نے ہر شخص میں

سمجھ رہا ہے۔ کہ ملکہ میری ہی طرف متوجّہ ہے۔ اور اسی بھروسے پر ہر ایک فخر و ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا۔

دیکھکر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہونچ سکتی تھی اور اس جگمگھٹ کے بیچ ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال میں آتا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا۔ کہ باغ امید کے اندر جانے کے دو دروازے ہیں۔ ایک داروغہ دانش کے کے اختیار میں ہے۔ دوسرا داروغہ خیال کے تحت میں ہے داروغہ دانش ایک تند مزاج اور وسواسی شخص ہے۔ کہ جب تک بہت سے سوال اُلٹے سیدھی حجتیں نہیں کرلیتا۔ تب تک قفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا مگر داروغہ خیال لیئق اور ملنسار شخص ہے۔ یہ اپنا دروازہ کھُلا ہی رکھتا ہے بلکہ جو اُس کی حد میں جائے اُس سے بڑی عزّت و توقیر سے ساتھ پیش آتا ہے چنانچہ جو لوگ داروغہ دانش کی حجتوں سے گھبراتے تھے۔ یا جنھیں اُس نے جانے نہیں دیا تھا۔ اُن لوگوں کی بھیڑ اُس کے دروازے پر لگ رہی تھی داروغہ دانش کے دروازے سے ملکہ کے تختگاہ خاص کو رستہ جاتا تھا۔ مگر اِس راہ کی زمین پھسلنی سڑک پتھریلی۔ رستے ایسے اینچ پیچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اِسی کو کہتے ہیں جب کسی قسمت والے کو وہاں سے اجازت ملجاتی تھی تو اس کٹھن گھاٹی میں دُکھ بھرنے پڑتے تھے اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستے کے اینچ پیچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے۔ اور جو جو بچاؤ کے مقام تھے۔ اُن میں قدم قدم پر

نشان کر لیتے تھے - مگر پھر بھی اکثر ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں - جنکا نشان و گمان بھی نہوتا تھا - بلکہ جہاں صاف سیدھا رستہ سمجھے ہوئے تھے وہاں کچھ ایسا تہلکہ پیش آتا تھا - کہ یکایک تھم جانا پڑتا تھا - ہزاروں الجھاؤں میں اُلجھتے تھے - صدہا رپٹوں میں رپٹتے تھے - بہتیرے ٹھوکریں کھا کھاکر گرتے تھے اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے تھے - غرض ایسی ایسی خطرناک وارداتیں اور ناکامی کے صدمے تھے - کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھاوے میں اُلٹے پھر آتے تھے - بہتیرے رستے میں غش کھاکر رہجاتے تھے بعض بعض ایسے بھی تھے کہ ان کی **استقلال** سے نے راہ کھی وہ اُس کی دستگیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہونچتے تھے انمیں اکثر ایسے ہوتے تھے - **حوصلے** کو دیکھکر پچھتاتے تھے کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے زیادہ تھی - یہ تو کامیابی نہیں ہوئی - حق تلفی ہوئی ہے - باقی جو لوگ اخیر انعام لیکر پھرتے تھے اُن کا انجام یہ ہوتا تھا - کہ **دانائی** داروغہ دانش کی **بی بی** ملکہ کی مصاحب تھی - وہ اُنکا ہاتھ پکڑتی تھی - اُس کی رہنمائی سے وہ لوگ گوشۂ قناعت میں جا بیٹھے تھے -

اے راہ امید کے مسافرو! چونکہ **داروغۂ دانش** کی حجتیں اور ان کے رستے کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں - اِسلئے میں نے داروغۂ خیال کی طرف رُخ کیا - یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی - وہ یہاں سے سرتاپا ساری نظر آتی تھی اور اپنی عجائب و

غرائب نایاب اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو برابر حُسنِ طلب کے انداز دکھاتی تھی۔ پھر بھی لطف یہ تھا۔ کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوا میں جدا جدا انداز سے اُڑا رہی تھی۔ جس سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو نگاہ مجھ سے۔ وہ کسی پر نہیں اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی امید نہیں۔ اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا۔ پہاڑ اس خیالی رستے کی طرف سے ایسا ڈھلوان تھا۔ کہ قدم نہ ٹھہر سکتا تھا۔ کیونکہ درہمی باتوں میں پائداری کہاں۔ باوجود اس کے آمدورفت کے نشان بہت کثرت سے تھے۔ کیونکہ اس رستے میں چلنے والے بہت ہیں۔ اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کو جاتا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہر شخص یہ جانتا تھا۔ کہ جو رستہ میں سے پایا ہے وہ کسی کو ہاتھ نہیں آیا۔

یہ بلا نصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے۔ بعضے تو ایسے کلدار پر لگانے کی فکر میں تھے۔ جن کی حرکت کبھی تھمے ہی نہیں بعضے کہتے تھے کہ جو ہو سو ہو۔ اپنی قدموں چلے جاؤ۔ بلا سے مر جاؤ۔ یہ سب حکمتیں کرتے تھے۔ اس پر بھی زمین سے اُٹھ نہیں سکتے تھے۔ اور اُٹھے تو وہیں گر پڑے۔ مگر یہاں پڑے تھے تاک ادھر ہی لگی تھی۔ اور اس حال تباہ پر **خود پسندی کا** یہ عالم تھا۔ کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اُنپر پڑے پڑے ہنستے تھے۔

اکثر خیالوں کے پیاسے اور وہم کے بندے۔ ایسے بھولے
بھالے تھے۔ انہوں نے اس باغ میں آکر اور ہی کی طرح چھوٹنے
کا ارادہ بھی نہ کیا تھا۔ یونہی ایک جگہ پڑے رہتے تھے۔ یہ مقام
کاہل گھاٹی کہلاتا تھا۔ اور ایک سنسان اور بے آزار موقع
پر تھا۔ مگر باغ یہاں سے بھی سامنے تھی یہ اسی یقین میں
خوش پڑے تھے کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آیا چاہتی ہیں
اگرچہ اور لوگ ان ویرانیوں کو احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے
مگر انھیں کچھ پروا بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ غم غلط لوگ اسی بھروسے
میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہمپر نظر عنایت ہوگی۔

انہی بے پرواؤں میں میں بھی پڑا پھرتا تھا۔ ان میں اتنا
لطف پایا کہ اگر کوئی بات کرے۔ تو اس کا جواب دیتے تھے۔ اور
اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے۔ اسی خیال میں
یکایک نظر پھیر کر جو دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ دو دیو ڈراونی صورت
بھیانک مورت اس گھاٹی میں چلے آتے ہیں۔ کہ ان کی کسی کو
خبر نہیں۔ ایک تو میں جانتا تھا کہ **عمر** ہے۔ مگر دوسرا **افلاس**
تھا ان کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاک
سیاہ ہوگئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ
ہو گیا۔ دلوں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ لوگ جو ڈر کے مارے
چیخیں مار مار کر چلاتے۔ تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا۔ اسی سے
میں بھی چونک پڑا۔ اور دیکھا۔ تو کچھ بھی نہ تھا۔

سوالات

۱۔ امید ہمارے اوپر کیا کیا تاثیرات پیدا کرتی ہے؟
۲۔ ثابت کرو کہ ہر حال میں امید کا ہونا ضروری ہے۔؟
۳۔ امید ہمکو کیا کیا دھوکے دیتی ہے۔؟
۴۔ مصنف کے خواب کا حال بیان کرو اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اُسے ظاہر کرو۔؟
۵۔ "گلشن امید کی بہار" کا خلاصہ مطلب تحریر کرو۔؟
۶۔ ملکہ امید۔ قسمت و نصیب۔ عیش مدام۔ فرحت دوام۔ داروغہ خیال۔ استقلال۔ حملہ۔ داروغہ دانش۔ خود پسندی۔ کاہل گھاٹی۔ افلاس کی تفصیل بیان کرو۔؟

ناامیدی

یہ مضمون منشی لطیف احمد صاحب۔ بی۔اے کا ہے جو منشی امیراحمد صاحب مینائی کے صاحبزادے ہیں۔ حیدر آباد میں ایک اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہیں۔ نظم و نثر دونوں اچھا لکھتے ہیں۔

انسان کا دل منبع ہے جذبات اور خواہشوں کا جذبات دلی کی حد مقرر کرنا دشوار ہے۔ لیکن خواہشوں کی انتہا اُن کے پورے ہونے تک ختم ہوجاتی ہے۔ مگر اُس کا سلسلہ طویل ہے۔ ایک خواہش کے بعد دوسری خواہش اس طرح نمودار ہوتی ہے جیسے زنجیر کی ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی۔ یہی جذبات اور خواہشوں کا متواتر ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے رہنا انسانی حیات میں کشمکش اور حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ایک خواہش پوری ہونے کے بعد دوسری پیدا نہو تو نہ صرف انسانی زندگی سست اور ساکن ہوجائے بلکہ انسانی کوششیں بند اور انسانی ترقی رُک جائے اور انسان جہاں اُس کی پہلی خواہش پوری ہو وہیں قانع ہوکر بیٹھ رہے

لیکن ایک آرزو بر آنے کے ساتھ ہی ابھی اسکا لطف اُٹھانے کا اور اپنی حرکت کو رُوک کر ذرا دم لینے کا موقع بھی نہیں ملتا کہ فوراً ہی ایک اور آرزو سابقہ آرزو کی جگہ لیکر دل میں گد گدی پیدا کرتی ہے۔ اور محنت کے مارے انسان کو اس طرح بیچین کرتی ہے کہ وہ اسیطرح کمر باندھے دوسرے کشاکش میں اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے اور پھر اپنی کوششوں کو تازہ دم کرکے اس نئی خواہش کے حاصل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ دوڑ انسان کی زندگی بھر رہتی ہے۔ سوائے اُس آخری وقت کے جب کہ موت اور اپنے قریبی انجام کا خیال اِن خواہشوں کو اُبھرنے نہیں دیتا اور وہیں دل ہی کے اندر اُنکا دم گھونٹ دیتا ہے۔

۔ ہر خواہش جو دل میں پیدا ہوتی ہے اُس کے دو انجام ہوتے ہیں۔ یا تو وہ خاطر خواہ پوری ہو یا نہو اگر ایک خواہش پیدا ہو جاتی ہے تو چاہیئے کہ اُس کے پورا ہونے پر دل کو خوشی اور راحت میسّر ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اور بیقرار دل کو آرام نہیں ملتا۔ خواہش کے پورا ہونے میں معاً اُس مطلوب سے ایک قسم کی سیری مائل بہ نفرت پیدا ہوجاتی ہے اور تازہ خواہش نئے تیر پیکاں سے پیراستہ دل کو چھیدنا شروع کر دیتی ہے۔ فوراً انسانی قوے دوسری طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ اور اُس سابقہ خواہش کا پورا ہونا بالکل بے مزہ اور ادنےٰ معلوم ہوتا ہے ایک خواہش کے بعد دوسری خواہش کے وجود میں آنے کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اور یہی انسان کو محنت کرنے

مصائب جھیلنے اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے پر تحریک اور تحریص کرتا ہے۔ یہی اس کی کوششوں کو برابر جاری اور برقرار رکھتا ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کی مصروفیت کا سبب ہے۔
لیکن اس دوڑ میں سرگرم رکھنے والی صرف امید ہے۔ اگر اس امید میں ذرا بھی تنزل ہو جاتا ہے تو کوششیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ دل برداشتہ ہونے سے حرکت بند ہو جاتی ہے۔ اور آخر وہ حالت سکون پیش آتی ہے۔ جس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھکر یا تو کسی غائبانہ امداد کی توقع کرنی پڑتی ہے یا خوشی سے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے کی نوبت آتی ہے۔ یہ آخری حالت انسان کی نہایت اضطراری حالت ہے اور اسی کا نام نا امیدی رکھا گیا ہے۔ جب کسی وقت انسان اس حالت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے لئے دنیا میں خوشی کے راستے سب طرف سے بند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ امید جو خوشی کی بشیر ہے اپنی آمد و رفت متوقف کردیتی ہے اور زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل اور وبال ہو جاتا ہے قوت متخیلہ بھی جسکا عمل امید کے ماتحت ہے کوئی دور نزدیک راحت اسکے لئے پیش نہیں کرسکتی۔ کوئی سامان اسکو اپنے دل کے مسرور کرنے کا نظر نہیں آتا۔ اس نا امیدی کا سیلاب جب ایک بدنصیب سامنے سے آتا ہوا دیکھتا ہے تو التجا کے ساتھ مایوسانہ لہجہ میں دفعتہً پکار اٹھتا ہے سہ
سنبھلنے دے ذرا اے نا امیدی کیا قیامت ہے کہ داماں خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
بہت سے ایسے لوگوں کو جنھوں نے خود کشی کرکے دنیا کے مصائب

سے نجات پائی ہے۔ بعض لوگ بزدل اور کمزور بتلایا کرتے ہیں۔
لیکن یہ بزدل بتلانے والے جوانمرد غالباً اس حالت سے آگاہ نہیں
ہوتے اور نہ اسکا اندازہ لگا سکتے ہیں جو نا امیدی کی حالت ہے
اگر یہ الزام لگانے والے اپنے دلیر دلوں میں کسی ایسے شخص
کی حالت کا تصور کریں گے جس کی ایک دلی آرزو پوری ہونے کی
کوئی صورت نہ ہو جسکو امید کی ڈھارس بندھانے والا چہرہ
کسی طرف نظر نہ آتا ہو جسے درد دیوار سے مایوسی کی آوازیں
آتی ہوں جس سے ہمدردی ظاہر کرنے والی کوئی زبان نہو تو
وہ دیکھیں گے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کی حالت حقیقی
طور پر قابل رحم ہے۔ زندگی اسکے لئے بے مزہ ہے۔ دنیا میں وہ
رہتا ہے مگر دنیا سے اسکو بہت دلبستگی ہے۔ جاننے پہچاننے
والے اس سے انجان بنتے ہیں اور کوئی متنفس نہیں کہ اسکے
درد کا شریک ہو۔ ایک ایسے شخص کی زندگی یقیناً کوئی زندگی
نہیں ہے اور وہ اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اور
یہی خیال جب اسکے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے تو وہ بار بار
زبان سے کہتا ہے ۔ زندگی! یہ زندہ رہنے کے قابل نہیں
اور آخر وہ ایسے دلیرانہ وار فعل کا مرتکب ہوتا ہے جسے صرف
اس کی حالت اور اسکا دل جائز سمجھ سکتا ہے۔

اے وہ لوگو! جن کے دامن گل مراد سے بھرے ہوئے
ہیں۔ اے وہ لوگو! جن کی آرزوئیں کامیابی کے چشمے سے سیراب
ہیں۔ تم خوش ہو۔ تمھارے چہرے بشاش اور منور ہیں۔ تمھارے

لبوں پر تبسم ہے اس لئے کہ تمھارے دل کا غنچہ اُس نا امیدی کے مُرجھا دینے والے جھونکے سے محفوظ ہے۔ جس کی ایک ہی لپیٹ اعضا کو نڈھال۔ چہرے کو زرد کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھوا کر بیٹھا دیتی ہے۔ جو دل میں وہ سوزش اور پژ مردگی پیدا کرتی ہے جس سے دل کے بخارات سرد آہوں کی صورت میں نکلتے ہیں۔ خدا کا شکر کرو۔ اور اِس مسرّت کے وقت کو غنیمت سمجھو اور خدا کرے تم اس بادِ سموم سے ہمیشہ امن میں رہو جسکے جھونکے مسرور سے مسرور دل کو افسردہ اور پژمردہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن اُن مجروح دلوں پر نہ ہنسو جنکو نا امیدی نے خستہ بنا رکھا ہے۔ وہ لوگ جن کی زندگی اُن کے لئے وبال ہے اور جو اِس وسیع دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں پاتے جو اُنکے مُرجھائے ہوئے دل کو ذرا شگفتہ کرے۔ وہ جنھیں سہارا دینے والی آس پاس کوئی چیز نہیں۔ وہ جو مایوسی کے اس درجے تک پہونچ گئے ہیں کہ جنھیں انسانی ہمدردی کا کوئی ثبوت نہ مِلا اور اِس بیکسی کی حالت میں وہ خدا پر بھی بھروسہ زائل کر کے اُس کی رحمت سے دل شکستہ ہو گئے ہیں اے کامیابی کے تاج پہننے والو! تم ایسی مخلوق پر ہنسو نہیں وہ لوگ ہیں جنکو اُن کی غیرت اور حمیّت نے موت سے بیخوف بنا دیا ہے جو اپنے ارادوں میں ایسے مستحکم ہیں کہ اپنی آرزوں پر اپنی جانیں قربان کرنا اپنی نجات سمجھتے ہیں یہ ایسے غیرت دار دل رکھنے والے ہیں کہ کسی کے بارِ احسان

اور مرہون منت ہونے کو اپنی زندگی سے بدتر جانتے ہیں۔ بہرحال اے دنیا کی مسرت سے فیضیاب ہونے والو! تم ایسے لوگوں سے ہمدردی کرو۔ اُنپر رحم کرو یا کم ازکم اُنکو اُن کے حال پر چھوڑ دو۔

اے وہ لوگو! جن کے ساتھ دنیا کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اے وہ کہ تم سے توقعات رکھنے والے تمھاری طرف آس باندھے تک رہے ہیں۔ اے وہ کہ تم دوسروں کی مرادوں کو سرسبز کرنے والے ہو کیا تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ تمھارے دست نگر۔ محتاج اور اُمیدوار لوگوں کی خوشی تمھاری ذات پر منحصر ہے۔ اور اُنکے دل کی شگفتگی کی اُمیدوار کلی مرجھاکر اُن کی زندگی کو اسقدر وبال جان کردیگی۔ اگر وہ تمھارے تیور اپنی امیدوں کے خلاف برگشتہ دیکھیں گے۔ مایوسی کی گرم پلیٹ اس غنچۂ دل پر جو مسرت کا مخزن ہے کیا اثر کریگی۔ جبکی تر و تازگی حیات کے لئے لابدی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جن لوگوں کے دل افسردہ مجروح اور مایوس ہیں۔ زندگی اُن کے لئے کوئی راحت نہیں رکھتی صرف تنفس اُن کے لئے عذاب ہے۔ اور وہ اشیاء آرام سوائے اس صورت کے کسی اور چیز میں نہیں دیکھتے کہ جسقدر جلد ہو اس دنیا کو خیرباد کہکر اس عذاب سے نجات پائیں۔

پس اے دلوں کی مراد برلانے والو! دیکھنا تم ایسے بڑے گناہ کے مرتکب نہونا کہ اس دل کو مایوس کرو۔ جس نے اپنی خوشی اور راحت کو تمپر چھوڑ رکھا ہے۔ اے لوگو! اگر تمھارے سینوں میں دل اور دلوں میں احساس ہے تو کسی اُمیدوار دل کو نا اُمید کرنا۔

سب کی بندھی ہوئی اُس کو دانستہ یا نادانستہ طور پر یا اپنی بے پروائی سے خاک میں نہ ملا دینا تمھارا ایک ادنیٰ فعل دوسرے کی خوشی پر بہت بڑا اثر ڈال سکتا ہے پس اِس امر کا خیال نہ رکھنا کہ ایسا گناہِ عظیم تم سے کبھی سرزد نہو کہ وہ امیدوار جو ایک امید لیے تمھارے در پر آتا ہے۔ اور خدا نے تمھیں اُس امید کے پورا کرنے کی مقدرت بھی دی ہے ایسا نہ ہو کہ وہ دل شکستہ تمھارے پاس سے مایوس جائے۔ تم دوسروں کی کار برآری کرو۔ خدا تمھاری کار برآری کریگا۔ اپنی زندگی کے طرزِ عمل میں اس بات کا ضرور خیال رکھنا کہ تم بھی دل رکھتے ہو۔ تمھارے دل میں بھی آرزوئیں اور امنگیں پیدا ہوئی ہیں اور رہونگی۔ اور تمھارے دل کبھی کم و بیش امیدوں کا سرچشمہ ہیں۔ ایسا نہو کہ تمھیں بھی وہ دن دیکھنا پڑے جو آج تمھارے تغافل اور لاپروائی سے دوسروں کو نصیب ہوا ہے۔ خدا نکرے کہ تمھارے شاد و خرم دل ناامیدی کی تلخی سے آگاہ ہوں۔

کون ہے وہ شخص جو اُس دل کی بیکلی سے آگاہ ہے جس کی تمناؤں کا خون زمانے کے دست ظلم نے کیا ہے۔ اور جس پر ناامیدی اپنی تاریک گھٹا سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جب وہ اپنے ایسے ہمجنسوں کو جو بعض باتوں میں اس کے برابر اور بہت سی باتوں میں اس سے کم ہیں۔ کامیابیوں سے سُرخرو دیکھتا ہے۔ تو جو رنج اُسکے دل کو کاٹتا ہے اور جو حسرت اُس کے سینے میں پیدا ہوتی ہے وہ ایسی ہے کہ اُس کی تکلیف اور اُس کے مزے سے

کوئی نہیں کہہ سکتا سوائے اُس مظلوم دل کے، کہ میں آگاہ ہوں
ہائے محرومی! تیری شکایت کس سے کیجائے اور تجھے کیا کہکر
لزام لگایا جائے انسانی کوشش کو ضرور پھل لانا چاہئے۔ مگر اُس وقت
جب وہ بالائی طاقت جسے بعض تقدیر سے اور بعض اتفاق سے تعبیر
کرتے ہیں اُن کے موافق ہو۔ اور اگر نہیں۔ تو اسے محرومی تقدیر
آ۔ آ۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے اور چل جہاں تک تو مجھے لیجا سکتی
ہے۔ لیکن دیکھ میری ایک حد مقرر ہے اس سے زیادہ دُور تو مجھے نہیں لیجا سکتی
موت کے سمندر کے کنارے پر پہونچکر میں تجھ سے بالکل آزاد ہوں
اور تیرا شکار جب چاہے تجھ سے آزادی حاصل کر سکتا ہے۔

(لطیف احمد)

سوالات

۱۔ اگر انسان کے دل میں ایک امید کے پورے ہونے پر دوسری امید پیدا ہو جائے تو اُس کا کیا نتیجہ ہو؟

۲۔ ہر خواہش دل کے انجام کس کس طرح ہوتے ہیں؟

۳۔ ناامیدی کی تعریف مصنف نے کیا کی ہے؟

۴۔ لوگوں نے کیوں خودکشی کے قبیح جرم کرکے اپنی جانیں دیں تمہاری رائے اس معاملہ میں کیا ہے؟

۵۔ خوشی کے وقت غنیمت سمجھنے کے متعلق تم کیا کیا دلائل رکھتے ہو۔

۶۔ جو لوگ ایسے لوگوں کو جن سے اُن کو امیدیں ہیں امیدوں کے خلاف دیکھیں تو اُن سے اُنپر کیا اثر ہوگا؟

۷۔ کسی کو امیدوار کرکے ناامید کرنے کا کیا نتیجہ؟

۸۔ محرومی کا اثر انسان پر کیا پڑتا ہے؟

عزت

عزت ایک اچھا خیال ہے جو انسان کی خود اختیاری اچھی

حالتوں کے سبب سے اُس کی بڑائی کی نسبت دل میں پیدا ہوتا ہے۔ عام اِس سے کہ وہ حالتیں علمی ہوں یا عملی قولی ہوں یا فعلی۔ باطنی ہوں یا ظاہری۔ لازمی ہوں یا متعدی۔ پس جو انسان جسقدر اپنی حالتوں کو درست کریگا۔ اور جتنا اچھے خیالوں۔ اچھی باتوں اچھے کاموں اچھی عادتوں سے موصوف ہوگا۔ اتنی ہی عزت کا مستحق ہوگا۔

عزت ہی وہ شئے ہے جس کے حاصل کرنے کا شوق انسان سے بڑی بڑی سخت محنتیں کراتا ہے اور اُسے بڑے بڑے رنج دیتا ہے اور جب وہ حاصل ہوجاتی ہے تو انسان اپنی زندگی بڑی خوشی سے کاٹتا ہے۔ سارے رنج و غم بھول جاتا ہے۔ انسان مرجاتا ہے اس کی ہڈیاں خاک ہوجاتی ہیں اُس کی خاک کا نشان بھی نہیں ملتا پر اُسکی عزت نہ مرتی ہے اور نہ خاک ہوتی ہے۔ ہمیشہ قائم اور برقرار رہتی ہے اور درحقیقت موت کی گمنامی سے محفوظ رکھکر انسان کو زندہ جاوید رکھتی ہے۔

عزت درحقیقت ایک نتیجہ اچھے کمالات کا اور ایک ثمرہ عمدہ صفات کا ہے اس لیئے جب تک کوئی کسی کمال سے کامل اور کسی صفت سے موصوف نہو وہ عزت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اور اسی طرح جو اچھے کمال کا جامع اور اچھی صفت سے متصف ہو وہ عزت کے استحقاق سے محروم نہیں رہتا۔

انسان کے اچھے خیال اچھی باتیں اچھے کام عزت کو ایسا کھینچ لیتے ہیں جیسا کہ مقناطیس لوہے کو یا کہربا گھانس کو وہ کسی سے اپنے

بزرگی و عزّت کا طالب نہیں ہوتا مگر لوگ خود بخود اُس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ کسی سے اپنی تعریف نہیں چاہتا مگر سب اس کی صفت خود کرتے ہیں کیونکہ انسان کی اچھی حالتوں کا یہ قدرتی خاصہ اور ذاتی تاثیر ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ پر جو شخص اپنے خیال رکھتا ہے اچھی صفات کا جامع ہوتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اچھا جانتا ہے۔ اپنی آپ عزت کرتا ہے۔ وہ مغرور تو نہیں ہوتا مگر اپنے آپ کو سچی عظمت میں جانتا ہے وہ کمینہ آدمی کی طرح جھوٹی شیخی تو نہیں رکھتا مگر ممدوح خودداری کا خیال رکھتا ہے۔ اُسکا دل اُس سچی عزت، اور ممدوح کی خودداری کے سبب سے ایک پُر رعب شہنشاہ کے مانند ہوتا ہے جسے اپنی شاہنشاہی پہ خود ناز ہو اسی واسطے وہ مخالفوں کے ذلیل کہنے سے اپنے آپ کو ذلیل نہیں جانتا۔ دشمنوں کے حقیر کہ دینے سے اپنی حقارت نہیں سمجھتا اُسکا دل ایک سچے آبدار موتی کے موافق جوہری کا تو طالب ہے مگر جھوٹے موتی کی جھوٹی چمک دکھانے سے اپنی بے آبروئی نہیں سمجھتا۔ وہ لعل بدخشانی کی طرح سلطانی تاج کی خواہش تو رکھتا ہے مگر کسی نادان مفلس کے پھینک دینے سے اپنی بے قدری نہیں جانتا۔ درحقیقت سچی عزت ایک قدرتی چشمہ کے موافق ہوتی ہے جسے کوئی خس و خاشاک روک نہیں سکتا۔ اور ایک روشن آفتاب کے مانند ہوتی ہے جس کی نورانی شعاعوں کو کوئی شپرہ چشم بند نہیں کرسکتا۔

جو شخص کسی قوم میں ایسی عزت کا مستحق ہو وہ درحقیقت

اُس قوم کا سہیل ہے جو اپنی قوم کے دلوں کو اپنے روشن خیالات کی برکت سے ساری غلاظتوں اور کثافتوں سے پاک و صاف کرکے ادیم یمنی کی طرح معطر اور منوّر کر دیتا ہے یا وہ نسیم بہاری کی خاصیت رکھتا ہے کہ اپنے نرم و لطیف روح افزا جھونکوں سے اپنے ملک کو باغ ارم بنا دیتا ہے۔ جس قوم میں کوئی ایسا شخص نہو وہ خارونکا ایک گلدستہ ہے جس میں کوئی پھول نہو۔ یا ریت کا ایک چٹیل میدان ہے جس میں کوئی بارور سایہ دار درخت نہو۔

(نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں)

سوالات

۱۔ عزت کیسا خیال ہے اور اُس کے استحقاق کی نسبت تم کیا جانتے ہو؟
۲۔ عزت حاصل کرنے کے لیے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے؟
۳۔ عزت کا استحقاق کب حاصل ہوتا ہے؟
۴۔ انسان کے اچھے خیال اچھی باتیں اور اچھے کام کیا کیا نتائج پیدا کرتے ہیں؟
۵۔ قوم کے سہیل سے کیا مراد ہے؟

شہرت

شہرت کا خیال کیسا دل خوش کن ہے۔ اس کی آواز کیسی مسرت خیز ہے اس کی تمنا کیسی دلفریب ہے۔ کونسا دل ہے جس میں وہ جاگزیں نہیں اور کونسا داغ ہے جو اس کے نام سے متاثر نہیں۔ شاہ و گدا امیر و غریب سب پر اس کی حکومت یکساں ہے۔ ہر شخص کشادہ پیشانی سے اُن مصائب اور تکالیف کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا ہے جو شہرت حاصل کرنے میں اُسے پیش آتے ہیں ہر شخص اس کی آن پر جان دیتا ہے اور ہر شخص کا یہی منشاء خیال ہے۔ بھلے اور بُرے سب اُس کے

جویاں اور اُس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

وہ شریر لڑکا جو اسٹریٹ فورڈ میں ایک اون بننے والے کے گھر میں پیدا ہوا تھا اور جس کے نزدیک چوری سے امیروں کے محفوظ جنگلوں میں سے ہرن کا شکار کرنا کچھ گناہ ہی نہ تھا۔ لندن میں پہونچکر ایک معمولی ایکٹر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ شہرت ہی ہے جس نے اس کو ڈراما نویسی کا اُستاد۔ شاعر بے بدل اور ماہر بے مثال تمام سے منوادیا اور ایک معمولی ایکٹر کے درجے سے اُس مقام پر پہونچا دیا ہے۔ جہاں آجتک کوئی نہیں پہونچا۔ جو جذبات و خیالات اور جو اصلی شاعری اُس کے ناٹکوں میں نظر آتی ہے۔ اس کی نظیر کہیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ مگر یہ جو کچھ ہے سب شہرت ہی کی کرشمہ سازی ہے۔

وہ معلّم اوّل جو اپنے فخر زماں اُستاد سے بھی گوے سبقت لے گیا۔ شہرت ہی کی اداے شیریں کا بسمل تھا۔ شہرت نے اس کو ایک غلط انداز سے دیکھا تھا۔ جس کو دیکھکر وہ وارفتہ ہو گیا تھا۔ نہ اپنی مفلسی کا خیال کیا اور نہ تکالیف و زحمت کا۔ اُسنے غلامی کو اُس آزادی پر جو پہلے اُسے میسّر تھی ترجیح دی۔ اور وہ کام کر گیا جس کا سکّہ آجتک دلوں پر جما ہوا ہے۔

وہ سیاح فلاسفر جس کا نام بچے سے لیکر بوڑھے تک کی زبان پر پایا جاتا ہے اور جو تمام دنیا میں اپنی حکیمانہ نصیحت اور اخلاقی مسائل کے لحاظ سے اپنا آپ ہی نظیر ہے شہرت ہی کی پُرفن آنکھوں کا سکا نہ ہوکر آسمان بلندی پر آفتاب کی طرح چمکا ہے۔ شہرت ہی اُس کی

سیاحت میں اُس کی ہمرکاب رہی ہے۔ اُس کو آگے بڑھنے کے لئے ہمت دلاتی رہی ہے۔ اور تکالیف میں اُس کی غمخوار بنکر اُس کو خلعتِ بقائے دوام عنایت فرمایا ہے۔

وہ ناخدا جس کو مہینوں سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھاتے گذر گئے ہیں۔ جس کے ساتھی اُس سے بد دل ہیں اور جو خود بھی کبھی کبھی عالمِ یاس میں پریشان نظر آتا ہے۔ اُس کا دل شہرت ہی بڑھاتی ہے اور اُسی کے خیال میں دنیا مافیہا سے بیخبر ہوگیا ہے اور اِسی کے پیچھے وہ اپنے تمام مصائب بھُول جاتا ہے۔ اور آخرکار نئی دنیا کا پتہ لگاتا ہے۔

وہ شاہزادہ جو اپنی بہادری کے سبب ایک ایسے عظیم الشان شہنشاہ سے جس پر ملکِ عجم فخر کرتا ہے لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں آتا ہے۔ اور کبھی ہند میں اور کبھی چین و رُوس میں اپنے جوہرِ مردانگی دکھاتا ہے یہ سب کچھ یہی شہرت اُس سے کراتی ہے اور اُس کو ایک چھوٹے بادشاہ کے درجہ سے ہفت اقلیم کا شہنشاہ بنا دیتی ہے۔

وہ سپہ سالار جو میدان میں ہزیمت پر ہزیمت اُٹھاتا رہا ہے کیوں سینہ سپر ہے اور کیوں جان توڑ کر لڑتا ہے۔ اِس لئے کہ شہرت کا خیال اُس کے دل میں ہے اور وہ اُس کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔

وہ موجد جو ہر دم نئی ایجاد کی اُدھیڑ بن میں رہتا ہے اُسے شہرت ہی اپنے پیارے چہرے کی جھلک دکھاتی رہتی ہے۔ اور اسی حاصل کرنے کے خیال میں وہ وہ ایجادیں کر جاتا ہے کہ بعد مرگ بھی اُس کا نام صفحۂ دنیا پر باقی رہجاتا ہے۔

وہ مصنف جو چاہتا ہے کہ اُس کے بعد اُس کا نام قائم رہے۔

کیسی دماغ سوزی اور جگر کاوی سے مضامین فراہم کرتا ہے صرف اس لئے کہ شہرت اُس کو حاصل ہو جائے۔

وہ شاعر جو نئے مضمون تلاش کرکے لاتا ہے شہرت ہی کے خیال میں مست رہتا ہے اور اسی کو اپنا منتہاے کمال بناکر آسمان ترقی پر چمکتا ہے۔ اگر وہ پورا شاعر نہیں ہوتا ہے تو کم از کم کسی خاص صفت کو لیکر اُسی میں کمال حاصل کرتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا چاہنے والا جو ہر وقت قومی ترقی کے خیال میں مگن رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو اُس کے دل میں شہرت کا جلوہ ہے اور یہی اُس کو قومی بہبودی اور فلاح کے کاموں میں منہمک رکھتی ہے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں شہرت وہ شے ہے کہ جب اُس کا خیال کسی کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے تو وہ پھر نکالے نہیں نکلتا ہرکام میں خاطر خواہ کامیابی اِسی کی مدد سے ہوتی ہے۔ بلکہ اُسکا خیال ہی کامیابی کی دلیل ہے۔

(محمد یحییٰ تنہا)

سوالات

۱۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے لوگ تکالیف کو کیوں بآسانی برداشت کرتے ہیں۔؟
۲۔ شہرت نے ولیم شیکسپیر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔؟
۳۔ معلم اوّل کس شخص سے مراد ہے اُس کے کچھ حالات تحریر کرو۔؟
۴۔ سیّاح فلاسفر سے کونسا شخص مراد ہے۔ اس نے کیا کیا کیا۔؟
۵۔ کلمبس کی شہرت کے اسباب تحریر کرو۔؟
۶۔ شاہزادے سے کون بادشاہ مراد ہے۔؟
۷۔ سالار۔ موجد۔ مصنف۔ شاعر اور قومی بھلائی کا چاہنے والا کس غرض سے کیا کیا کرتا ہے۔؟

سچّی مسرّت

مسرّت نہ روپیہ ہے نہ پیسہ ہے نہ عالی شان قصر و ایوان ہیں
نہ خدم و حشم ہیں نہ حکومت و سطوت ہے۔ اس لئے کہ اگر ان چیزوں
سے حقیقی مسرّت حاصل ہوتی تو ہم کسی بادشاہ و امیر کو ملول و افسردہ
نہ پاتے اور اُن کے دل میں اور اُن کے اِس امیرانہ بلکہ شاہانہ دھوم
دھام میں سچ پوچھئے تو ہمارے غموں سے بڑے غم اور ہماری حسرتوں
سے زیادہ حسرتیں موجود ہیں جس طرح ایک کوہستانی سلسلہ دُور سے
تمھیں نہایت سطح پُرفضا اور دلچسپ معلوم ہوتا اور نزدیک سے
جاکے دیکھو تو انتہا سے زیادہ غیر مسطح بہت ہی پُرخطر اور وحشت
ناک نظر آتا ہے اُسی طرح اے غریبی کی زندگی بسر کرنے والو!
امیروں اور بادشاہوں کی سطوت و حشمت اور اُن کے عالی شان قصر
و ایوان تمھیں دُور ہی سے عشرت و مسرّت کے مامن نظر آتے ہیں
مگر اُن کے قریب جاکے خود اُن کی جگہ پر کھڑے ہوگے اور اُن کی
اصلی حالت کا اندازہ کرکے غور کرو تو صاف دیکھ لوگے کہ خوشی اور
مسرّت اُن کے اِس وسیع اور بڑے شہانے میں تم سے کبھی کم اور
بہت ہی کم ہے۔

اصلی خوشی ایک دلچسپ خیال سے عبارت ہے جو اکثر اُس دل
میں زیادہ ہوتا ہے جس میں خواہشیں کم ہیں۔ جسقدر تم اپنی ضرورتوں
کا دائرہ تنگ کرتے جاؤگے اُسی قدر تمھاری مسرّت بڑھتی جائیگی
جس سے بڑے بڑے اور نہایت ہی عالی مرتبہ اور صاحب حکومت

امیروں کو ادنےٰ طبقے کے مزدوروں اور مزدورنیوں پر حسد کرتے
دیکھا ہے۔ یہ معمولی درجے کے لوگ جنھیں تم اپنے فضول اور بیہودہ
غرور سے ادنےٰ اور کمتر اور حقیر اور ذلیل خیال کرتے ہو اُن کی
حالت کا جب اندازہ کروگے تو عام طور پر اُنھیں اپنے سے زیادہ
خوش پاؤگے۔ سعدی کے کلام میں اس بادشاہ بنجانے والے فقیر
کا یہ جملہ کہ "آں دم غمِ نانے بُود و اکنوں غمِ جہانے" آبِ زر سے
لکھنے کے قابل ہے۔ اِن غریبوں کو فقط اتنی فکر ہے کہ قوتِ لایموت
کے لئے دن بھر میں کچھ پیسے فراہم کرلیں جن کے حاصل کرنے کی
کوشش میں وہ ہر قسم کی محنت کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔
پھر اس محنت کے بعد جب شام کو اپنے بی بی بچّوں میں آکے
بیٹھتے ہیں تو اُنسے زیادہ مسرور اور خوشحال کوئی نہیں ہوتا۔ اُن کی
محنت اُن میں رات کے آرام کی قدر پیدا کرتی ہے اور اُس محنت
کا حاصل کیا ہوا مختصر سرمایہ اُن کی فکریں دُور کر دیتا ہے۔ اور
یہ دونوں ایسی برکتیں ہیں جن کی بدولت روز شام کو اُنھیں وہ
اطمینان اور فارغ البالی اور وہ خوشی وہ خرمی حاصل ہوجاتی ہے
جو اُن سے زیادہ استطاعت رکھنے والوں کو کبھی زندگی بھر نہیں
نصیب ہوئی۔

ان لوگوں کی حالت دیکھکر تمھیں یہ بڑا سبق مل سکتا ہے کہ
اگر تم بھی اپنی فکریں محدود اپنی ضرورتیں کم اپنی خواہشیں دل سے
نکالدوگے تو تمھیں بھی اصلی خوشی حاصل ہوجاویگی۔ اس لیے اگر
تمھیں حقیقت میں خوشی و مسرّت کی تلاش ہے تو اسی عبارت

کے محل۔ سلطنت کے دربار اور ظاہری عیش و عشرت کی صحبتوں میں نہ ڈھونڈھو۔ بلکہ اُسے غریب کے جھونپڑے میں جاکے تلاش کرو۔ وہ وہیں ملیگی۔ اور اکثر وہیں رہتی ہے۔

اِس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ خدا کے خزانے میں خوشی کی کمی نہیں وہ وہاں کثرت سے موجود ہے۔ اور ہمیں کثرت سے مل سکتی ہے مگر خرابی یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اپنی ناسمجھی اور غلط خیال سے اُسے ٹھیک جگہ جاکے نہیں ڈھونڈھتے۔ اُن کے دھوکا دینے کے لیئے دنیا والوں نے شہوت پرستی کی صحبت کا نام محفل عیش رکھدیا ہے۔ اکثروں کے خیال میں بسی ہوئی ہے۔ کہ خوشی صرف ناز و نعمت کے قصروں۔ دولتمندی و سلطنت کے محلوں۔ اور حکومت وسطوت کے ایوانوں میں رہتی ہے۔ اور وہیں اُس کے ڈھونڈھنے کو وہ جاتے بھی ہیں جس کی بدولت طرح طرح کی ذلتیں اُٹھاتے ہیں مغلوب و مقہور ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنے اور خوشامد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور اِن سب خرابیوں اور تباہیوں کے برداشت کرنے کے بعد غور کرتے ہیں تو اپنے دل میں خوشی کا نام و نشان بھی نہیں پاتے۔ اِس غلط راستے کو چھوڑ کے اگر غربت کے جھونپڑوں اور بیفکری کے چھپروں کے نیچے دیکھیں تو وہ لعل بے بہا ضرور ہاتھ آجائیگا جس کے لیئے اُنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے عالیشان محل اور زبردست قلعے چھان مارے تھے۔

انسان جس وقت اور جتنی دفعہ اپنے دل میں یہ کہتا ہے کہ "یہ چیز ملنی چاہیئے" اُسی وقت اتنی ہی دفعہ ایک فکر اور اُس کے

ساتھ ہی ایک غم اپنے لئے پیدا کرلیتا ہے۔ اگر یہ نہ کیے اور اس مجلے کے خیال سے اپنے دل کو بچائے تو بہت ہی جلد غم سامنے سے بھاگ جائے اور وہ خوشی مل جائے جسے تباہی اور پریشانی کے ساتھ ذلتیں اُٹھا اُٹھا کے ہر طرف ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں اور عام طور پر مشہور ہے کہ پیٹ کے لئے انسان ذلیل ہوتا ہے اور اُسی کی وجہ سے کبھی اطمینان نہیں نصیب ہونے پاتا۔ مگر غور سے دیکھو تو جسقدر سہل الوصول قوت لایموت ہے کوئی چیز نہیں خدا نے چونکہ یہ ایک لازمی خواہش انسان میں پیدا کی ہے اسی وجہ سے اُس کے دور ہونے اور بھوک کی ضرورتیں رفع ہونے کا جتنا سامان خدا نے پیدا کر دیا ہے اور کسی چیز کا نہیں یہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خواہش پوری کرنے کے لئے ساری دنیا الوانِ نعمت کا ایک پر تکلف خوان بنی ہوئی ہے اگر چاہو تو قدم قدم پر پیٹ بھر سکتے ہو۔ بہت تھوڑی محنت اور بالکل معمولی درجے کی زحمت اُس کے لئے بخوبی کافی ہوسکتی ہے غریب اور امیر اور بادشاہ و وزیر کے روزانہ مصارف پر نظر ڈالو تو حیرت سے دیکھوگے کہ سب سے کم خرچ اُسی چیز میں ہوا جو صرف پیٹ بھرنے اور بھوک کی آگ بجھانے کے لئے تھا۔

تمھیں ذلیل کرنے والی اور زیادہ پریشان و سرگرداں بنانیوالی عموماً وہی خواہشیں ہیں جن کو اس فطری تقاضے یعنی بھوک سے علاقہ نہیں۔ بلکہ وہی خواہشیں ہیں۔ جن کو تم نے اپنی جھوٹی پہنیولی کے لئے خود ہی تصنیف کرلیا ہے۔ اُن سے پیچھا چھڑاؤ۔ ان کو

دل سے بھلاؤ اور دیکھو کہ سچی مسرت اور بے عمل و غش خوشی تمھارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ (مشرر)

سوالات

۱۔مسرت سے کیا چیز مراد ہے اور وہ کب حاصل ہوتی ہے۔؟
۲۔اصلی خوشی حاصل ہونے کے لیے کیا کیا شرائط ہیں۔؟
۳۔اگر ہم اپنی فکروں کو محدود اور ضرورتوں کو کم کردیں تو کیا نتیجہ ہو۔؟
۴۔ثابت کرو کہ خوشی کی کمی کے اسباب ہم خود پیدا کردیتے ہیں۔؟
۵۔فکر و غم کے اسباب کیا ہیں۔؟
۶۔ثابت کرو کہ قوت لایموت سہل الوصول ہے۔؟
۷۔ہوس پرستی چھوڑنے سے کیا کیا فوائد مترتب ہوسکتے ہیں۔؟

خطوط از موعظۂ حسنہ

خط فارسی تمھارا پہونچا میں تمکو خود چند بار فارسی کی طرف متوجہ کرچکا ہوں۔ اس میں کیا شک ہے کہ اردو سے فارسی بمدارج بہتر ہے۔ اتنی بات سمجھ لو کہ انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ یہ سب دوسرے ملکوں کی زبانیں ہیں ہمکو بلحاظ معاشرۃ اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان درکار نہیں۔لیکن اردو ابھی حالت طفلی میں ہے۔ یعنی صرف ڈھائی تین سو برس اس کو پیدا ہوئے گذرے ہونگے۔میر تقی۔ اور سودا کے اشعار میں بھی بہت سے الفاظ عجیب پائے جاتے ہیں۔جو اب متروک و مہجور ہیں۔ جیسے جاگہ بجاے جگہ۔ستی بجاے سے۔ ۲ تیاں بجاے ایکیں وغیرہ۔شروع میں بھاکا کے الفاظ اردو میں اس کثرت سے تھے کہ ابتدائی فقرو کا ایک جملہ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔سب سے پہلا

اُردو کا شاعر یعنی ریختہ گو ولی تھا۔ اُس کے اشعار سُنو تو ہنستے ہنستے
لوٹ جاؤ۔ لیکن یوماً فیوماً اُردو کی تہذیب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ
میر تقی نے ایسا ریختہ کہا کہ فارسی کو مات کیا۔ سودا اُنکا ہمعصر
تھا۔ ازاں بعد ناسخ و آتش کا زمانہ ہوا تو ان کی بولی اور بھی صاف
ہے۔ اب آخر میں شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ حکیم مومن۔ میرزا غالب
اور دبیر و انیس لکھنوی نے اُردو کو تو خوب رونق دی۔ انگریز
بھی کبھی کبھی کچھ توجہ کرتے ہیں۔ کہ اُردو کو رونق ہو۔ مگر یہ سیکڑوں
برس کے کام ہیں۔ غرض اُردو میں افسوس ہے کہ علم نہیں اور بولی
ٹھولی کا بھی وہ لطف نہیں جو عربی فارسی میں ہے۔

بشیر۔ عربی کا جب تمکو مزہ ملے گا تو یقین و باور کرو آدمی پر
وجد کی کیفیت طاری ہو ہو جاتی ہے۔ مفتی صدر الدین خاں مرحوم
کو میں نے دیکھا کہ با ایں وقار مجمع امتحان میں انگریزوں کے روبرو
گانے لگتے تھے۔ علم اور لطفِ زبان کی جُست و جو میں ہم دوسری
زبانوں کے حاجتمند ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ نری اُردو سے کام نہیں
چلتا۔ اور چار و ناچار دوسری زبان سیکھنی پڑتی ہے۔

اب دوسری زبان کونسی اختیار کی جائے جس کے ذریعے سے
علم حاصل ہو اور بولی کا مزہ ملے۔ سو برخوردارا وہ زبان انگریزی
ہے۔ کلام الملک ملوک الکلام (بادشاہ کا کلام کلام کا بادشاہ ہوتا
ہے) انگریزوں کی جست و جو انگریزوں کی تلاش و محنت اِس
درجے کی ہے کہ کسی قوم نے اس صفت میں ان کی ہمسری نہیں
کی۔ اب انگریزی کا یہ حال ہے کہ گنجینۂ علوم ہے یونانی اور عربی

اور عبرانی اور سنسکرت اور لیٹن وغیرہ میں جو ذخیرے تھے انگریزوں
نے سب اپنی زبان میں جمع کرلئے۔ اب یہ عجیب بات دیکھی جاتی
ہے کہ اصلی زبان میں اُن علوم کا پتہ نہیں مثلاً جبر و مقابلہ
در اصل عربی میں تھا اس کا نام الجبرا اسکا گواہ ہے۔ انگریزوں
میں کوڑیوں جبر و مقابلے ہیں۔ عربی میں مجکو تو آجتک کوئی رسالہ
دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور غالب ہے کہ مصر و روم میں بھی
ہونگے تو اب انگریزی کتابوں کے ترجمے ہونگے اصلی کتابیں معدوم
اور مفقود۔

اِس سے قطع نظر انگریزی زبانِ حکامِ وقت ہے اگر اِس میں
علوم نہ بھی ہوتے تو اس کا زبانِ حکامِ وقت ہونا کافی تھا کیونکہ
اِس صورت میں وہ ذریعۂ رسائی ہے۔ غرض جس جس پہلو سے دیکھا
جاتا ہے سب سے مقدم انگریزی اُس کے بعد عربی۔ اِس لئے کہ وہ
کلاسکل ہے۔ فصاحۃ اور بلاغۃ اِس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔
سب کے بعد فارسی وہ بھی اس وجہ سے کہ ہماری اُردو میں فارسی
کی ترکیبیں بہت ہیں۔ اور فارسی کے بدوں تکمیل اُردو ممکن نہیں
حاصل کلام فارسی کو اتنا دیکھو کہ اصل مطلب فوت نہو۔ یہ کون کہے
کہ فارسی کچھ نہیں۔ کسی چیز کا جان لینا اُس کے نہ جاننے سے
بہتر ہے اگر کسی کو موقع ملے تو۔ اُس کو سنسکرت اور ترکی اور
پشتو اور چینی زبانوں کا سیکھنا تضیعِ وقت سے بہتر ہے۔ تم تکمیل
انگریزی پر اپنی تمام ہمت صرف کرو فارسی کو لہو و لعب کے عوض
رکھو لیکن د فارسی میں ہزاروں الفاظ عربی کے ہیں اُن کو نظرانداز

مت کرو۔ تحقیق عجب چیز ہے۔ جو کرو تحقیق کے ساتھ کرو۔

اصلاح کے متعلق یہ بات ہے کہ مبتدی مثل اس لڑکے کے ہے جو چلنا سیکھتا ہے اور اصلاح دہندہ اس کو چلنا سکھاتا ہے ہم لوگ بچوں کو انگلی پکڑا دیتے ہیں۔ لیکن چلنے کا سارا بوجھ لڑکے پر ڈالتے ہیں۔ مگر فرض کرو کہ بجائے انگلی پکڑا دینے کے ہم لڑکے کو بٹھادیں اور خود ساری عبارت لکھدیں تو اس سے مبتدی کو کچھ نفع نہیں بڑی اصلاح شوق ہے۔ جی کو لگی ہوتی ہے تو آدمی وہ نکالتا ہے جو استاد کو نہ سوجھے۔

بشیر! اگر تم چار پانچ برس لگ لپٹ کر محنت کر ڈالو تو کچھ بات نہیں۔ پھر انشاء اللہ تعالےٰ ساری عمر اس محنت کا فائدہ اٹھایا کروگے۔ میں نے جس بے سروسامانی سے پڑھا تمھاری ماں اس کی گواہ ہیں۔ انھیں سے پوچھو کہ مجھکو اطمینان سے سونا حرام تھا یہ محنت ایک حیلہ ہوگئی اور خدا نے مجھکو افلاس اور بے توقیری کے عذاب سے نجات دی۔ تم بھی تو کبھی اپنی حالت کو میری اس حالت سے مقابلہ کیا کرو۔ اب جو میں سست اور کاہل ہوگیا ہوں تو اس وجہ سے کہ کوئی اختیاری تدبیر باقی نہیں ورنہ اس پیری میں بھی میری کتاب بینی جوان ہے۔ بار بار امتحان وکالت کو جی للچاتا ہے لیکن بیس برس کی خدمت اور تعزز پر نظر کرکے ہمت قصور کرتی ہے۔ اب جو مجھ سے رکھا ہے تم کرو۔ (ع) اگر پدر نتواند پسر تمام کند ۔ انگریزی کا انتظام ابھی حاطر خواہ تم نے نہیں کیا۔ مگر اعرکے قواعد مستحفظ ہوں۔ اور جو پڑھو سو از بر

اصلاح دینے والا کوئی آدمی با استعداد ہو- اور ہر وقت ایک دُھن لگی رہے- تب جانو کہ انگریزی آئی- اور انگریزی کی کیا تخصیص ہے ہر علم کا یہی حال ہے-

(نذیر احمد دہلوی ۱۲ مارچ ۱۸۹۰ء)

سوالات

۱- اُردو زبان کی عمر کب سے شمار کی جاتی ہے اُس کے مشہور شعرا اور متروکات کا کچھ ذکر کرو-؟

۲- عربی کا مزہ کب آ سکتا ہے-؟

۳- انگریزی زبان کے متعلق مصنف نے اپنے خیالات کیا ظاہر کئے ہیں-؟

۴- انگریزی تمام زبانوں سے مقدم کیوں خیال کی جاتی ہے-؟

۵- عربی اور فارسی کی کس قدر ضرورت ہے-؟

۶- اصلاح سے کیا مراد ہے-؟

۷- مصنف نے بشیر کو کس طرح پڑھنے کی ہدایت کی ہے اور اپنے پڑھنے کا حال کس طور پر بیان کیا ہے-؟

خط ۲-

بیوی صاحب کو بعد سلام کے معلوم ہو- یہ کبھی دنیا کا دستور قرار پا گیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مرجاتا ہے تو اُس کی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں- میں تمکو یہ خط اُس دستور کے مطابق نہیں لکھتا- کیونکہ مصیبت تنہا تم پر نہیں مجھ پر بھی ہے- میاں بی بی کا عجب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح کے ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں- یہ بات کسی اور رشتہ میں نہیں پائی جاتی- میرا تمھارا مال مشترک- گھر مشترک- کھانا پینا مشترک- اولاد مشترک- آبرو مشترک- رنج و غم مشترک- اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری

اکیلے کی بیٹی ہوتی نہیں میری تمھاری دونوں کی۔ بس اگر مرگئی تو کیا تمھاری اکیلے کی بیٹی مری۔ نہیں۔ میری تمھاری دونوں کی۔ پھر بھی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اُس سے بڑا قوی تعلق تھا لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہے میرا دل خود بخود بیقرار تھا۔ اور میں نے اُسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا تاریخ ملاکر دیکھو۔ غالب ہے کہ خط کی تاریخ اور اُس کے مرنے کی تاریخ ایک ہوگی۔

ظہیر۔ نصیر وغیرہ کے مرنے سے یہ تو بخوبی تجربہ کرچکے کہ موت پر انسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا۔ رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوجاتا ہے۔ مَیں تُم پر الزام نہیں لگاتا۔ اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کس قدر پیار کرتا تھا۔ اُس کی قبر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور مَیں سوتا بھی ہوں ہنستا بولتا بھی ہوں۔ دنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹا۔ تو جب ظہیر نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا تو یہ لڑکی بیچاری کے دن کی تھی۔ آخر پھر دنیا اور دنیا کے کام۔ کتابوں میں بہت ٹھیک لکھا ہے کہ دانا اور احمق صبر دونوں کرتے ہیں۔ مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ احمق رو دھوکر چُپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کرکے چُپ ہو رہتا ہے۔

غرض صبر تو آخر کرنا پڑیگا۔ پس کیا فائدہ کہ اپنا ثواب ضائع کریں۔ دل کو مضبوط کر آنسو پونچھ سنبھل بیٹھو۔ خدا ہمارا مالک ہے۔ اُس نے دیا۔ اُس نے لیا۔ خدا کو ہم سے عداوت نہیں۔ بَیر نہیں۔ جو کچھ کرتا ہے ہمارے نفع کے لئے کرتا ہے۔ لیکن اپنی کم فہمی کی

وجہ سے ہم اُن مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دنیا کے انتظام پر نظر
کرو۔ تو تندرستی۔ مال۔ اولاد و حکومت۔ شرافت۔ عہدداری۔ ہزاروں
طرح کی نعمتیں ہیں اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق
لوگوں میں تقسیم کی ہیں۔ ہمکو بھی اُس نے اپنی رحمتوں میں سے
بہت بڑا حصہ عطا فرمایا ہے۔ تو کیا ہم ٹھیکہ دار ہیں کہ خدا کی
سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں۔ اور پھر اولاد سے بھی
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے محروم نہیں۔ اُن کی عمروں میں خدا برکت
دے۔ اِن کو دین و دنیا کی فلاح ہو۔ کافی ہیں۔ اب زیادہ اولاد
لیکر کیا کروگی۔ انھیں پر اپنی ہمت صرف کرو۔ اُن کے حق میں
خدا سے دعائیں مانگو۔ اور مصیبت پر صبر کرو کہ خدا کی مرضی۔
شاید عاقبت میں انھیں مصیبتوں کے طفیل سے ہمپر رحم ہو۔
کسی اُستاد کا کیا اچھا قطعہ ہے

قسمت کیا ہر ایک کو قسامِ ازل نے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا غم ہمکو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اے خدا ہمکو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آدمی کو چاہیئے کہ جب
اُس پر کوئی مصیبت نازل ہو دوسرے بندگانِ خدا کے حال پر نظر
کرے وہ پائیگا کہ ہزاروں آدمی اُس سے بدتر حالت میں مبتلا
ہیں۔ بڑی ناشکری کی بات ہے کہ ہم نوکروں احسان اور چھوٹے بڑے
سلوک بھول جائیں اور تنکے بھر رنج کی برداشت نکریں۔ بشیرہ بیچارہ
ہے۔ تمکو روتے دیکھکر سہا جاتا ہوگا۔ اُس کے حال پر رحم کرو۔
اپنے حال پر رحم کرو کہ کیا تمھاری حالت ہوگئی ہے۔ آخر یہ کاہے

خاکی سدِ سکندر تو نہیں ہے۔ اِسی طرح رنجوں کے مارے اس کو تحلیل کر ڈالوگی تو کیا انجام ہوگا۔

(نذیر احمد دہلوی - ۱۴ر جون ۱۸۶۸ء)

سوالات

۱۔ اولاد کی محبت میں والدین کی شرکت مصنّف نے کس طرح سے ظاہر کی ہے۔؟
۲۔ مصنّف نے موت پر انسان کے بے قابو ہونے کی نسبت کیا ذکر کیا ہے۔؟
۳۔ صبر کے لیے مصنّف نے کس طریقے سے ہدایت کی ہے۔؟
۴۔ صبر کے لیے مصنّف نے خدا سے کیا دعا مانگی ہے۔؟

رقعاتِ غالب

بنام منشی ہرگوپال صاحب تفتہ

صاحب! کیوں مجھے یاد کیا کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ لکھتا ہوں کہ خدا تمکو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پینشن کی فکر میں تھے۔ ظاہراً یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی حق تعالیٰ جو اُنکی مراد ہو بر لاوے۔ اُن کو میرا سلام کہدینا بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا مولوی قمرالدین خاں کو بھی سلام کہنا۔ تم اپنے کلام کے بھیجنے میں پرسش کیوں کرتے ہو چار جزو ہوں تو بیس جزو ہوں تو بے تکلف بھیجدو۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہگیا ہوں بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھکر حیران رہجاتا ہوں۔ کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر

(۵) اجزا جلد بھیجدو۔ (غالب یکشنبہ۔ ۲۲۔ اپریل ۱۸۵۸ء)

سوالات

۱۔ مصنف نے اپنے آپ کو بوڑھا پہلوان کیوں بیان کیا ہے۔؟

ایضاً

آؤ مرزا تفتہ! میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو میری حقیقت سنو۔ یکشنبہ کو جو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تمکو اُن کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ٹنگمٹن صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کرکے اپنی طرف سے تمکو لکھا دونوں دیوان تمھارے۔ نشتر عشق۔ اور تذکرہ۔ اور یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی اُن کو پہونچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے بہت معتقد ہیں کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہوگا۔ کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح لکھینگے باقی ما بخیر شما بسلامت فقط (نجات کا طالب غالب)

سوالات

۱۔ گلے لگ جاؤ اور بیٹھو سے کیا مراد ہے۔؟

۲۔ پچاس ہزار بیت کا مالک کس سے مراد ہے۔ اور اسکا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔؟

بنام قاضی عبد الجلیل صاحب

جناب مولوی صاحب! آپ کے دونوں خط پہونچے میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحب فراش ہوں۔ جیسے دن سے پاؤں پر ورم ہوگیا ہے۔ کف پا و پشت پا

سے نوبت گذر کر پنڈلی تک آماس ہے۔ جوتے میں پاؤں سماتا نہیں۔
بول و براز کے واسطے اٹھنا دشوار۔ یہ سب باتیں ایک طرف دوا محلّلِ
روح ہے۔ ۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا
مگر اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا ہوں۔ حیران ہوں
کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر کیوں جیتا ہوں۔ روح میرے
جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل۔
کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت۔ شعر
سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت۔ یہ جو لکھا ہے بے مبالغہ
اور بیان واقع۔ مصرعہ خرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم +
ایسے مخمصہ میں اگر تحریرِ جواب میں قاصر رہوں تو معاف ہوں۔ مجھے
کیوں شرمندہ کیا۔ میں اس ثنا و دعا کے قابل نہیں ہوں۔ مگر اچھوں
کا شیوہ ہے بُروں کو اچھا کہنا۔ اس مدح گستری کے عوض میں
آداب بجا لاتا ہوں۔

سوالات

۱۔ مرزا نے اپنی حالت کیا ظاہر کی ہے۔؟ اور دعا و ثنا کی معذرت کیا کی ہے۔؟

بنام مرزا علاؤ الدین خاں صاحب

سنو عالم دو ہیں ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل
حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم
اور پھر آپ جواب دیتا ہے للہ الواحد القہّار۔ ہرچند قاعدۂ عام
یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں۔
چنانچہ ۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھکو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔

۱۲ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم حبس دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈالدی۔ اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈالدیا۔ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جب میں جیلخانے میں سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتکڑیاں اور بڑھادیں پاؤں بیڑی سے فگار۔ ہاتھ ہتکڑیوں سے زخمدار مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی طاقت یکقلم زائل ہوگئی۔ بیحیا ہوں۔ سالگزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ۔ مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگونگا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہیں۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں بہرتقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔ شعر

فرخ آن روز کہ از خانۂ زنداں بروم سوئے شہر خود ازیں وادئ ویراں بروم

سوالات

۱۔ عالم ارواح اور عالم آب و گل سے کیا مراد ہے؟

۲۔ مصنف نے دنیا کو اپنے لئے قید خانہ اور کاروبار کو مشقت کیوں بیان کیا ہے؟

۳۔ مصنف نے اپنی میت کو قید سے رہائی پانے کے اسلوب میں کیوں ظاہر کیا ہے؟

بنام نواب انوار الدولہ سعید الدین خانصاحب

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خداوند نعمت آج دوشنبہ ۷- رمضان کی اور ۱۵- فروری کی ہے۔
اِس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں عطوفت نامہ پہونچا اِدھر پڑھا اُدھر
جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نرہا خط کو معنوں کر رکھتا ہوں۔ کل شنبہ
۱۶- فروری کو ڈاک میں بھجوا دونگا۔ سال گذشتہ مجھپر بہت سخت گذرا
بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا۔ اُٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا؟
نہ تپ نہ کھانسی نہ اسہال۔ نہ فالج نہ لقوہ۔ ان سب سے بدتر۔
ایک صورتِ پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں
تک بارہ پھوڑے ہر پھوڑا ایک زخم ایک غار۔ ہر روز بے مبالغہ
بارہ تیرہ پھاہے۔ اور پاؤ بھر مرہم درکار تو دس مہینے بیخور و خواب
رہا ہوں۔ اور شب و روز بیتاب۔ راتیں یوں گذری ہیں کہ اگر کبھی
آنکھ لگ گئی۔ دو گھڑی غافل رہا ہونگا کہ ایک آدھ پھوڑ میں
ٹیس اُٹھی۔ جاگ اُٹھا۔ تڑپا کیا۔ پھر سُو گیا۔ پھر ہوشیار ہوگیا سال بھر
میں سے تین حصے دن یوں گذرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین
مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہوگیا۔ نئے سر سے رُوح قالب میں آئی
اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اَب اگرچہ تندرست ہوں۔
لیکن ناتوان و سست ہوں حواس کھو بیٹھا حافظہ کو رُو بیٹھا۔ اگر
اُٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اُٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قدِ
آدم دیوار اُٹھے۔ آپ کی پُرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جبتک
میرا مرنا نہ سُنا خبر نہ لی۔ میرے مرگ کی خبر کی تقریر اور مثلاً میری یہ

تحریر آدھی سچ اور آدھی جھوٹ در صورت مرگ نیم مُردہ اور در حالتِ حیات نیم زندہ ہوں ؎

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن   اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتواں اینہاست

اگر ان سطور کی نقل میرے کرمفرما مولوی غلام غوث خانصاحب بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجئے تو انکو خوش اور مجکو ممنون کیجئے گا۔

سوالات

۱۔ مصنف نے اپنی علالت کا حال کیا کیا لکھا ہے۔؟

۲۔ مرزا کو بیماری سے کیا کیا نقصانات پہونچے۔؟

بنام خواجہ غلام غوث خاں بہادر بیخبر

جناب عالی! آج دوشنبہ ۳۰۔ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے۔ ترشح ہو رہا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے پینے کو کچھ میسّر نہیں ناچار روٹی کھائی ہے۔ غمزدہ دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا سرنامہ کو دیکھکر اس راہ سے کہ دستخط خاص کا لکھا ہوا ہے بہت خوش ہوا خط کو پڑھکر اس رو سے کہ حصولِ مدعا کے ذکر پر حاوی نہ تھا افسردگی حاصل ہوئی۔ اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ یا آنکہ خط جواب طلب نہ تھا۔ جواب لکھنے لگا پہلے تو یہ سُنئے کہ آپ کے دوست کو آپکا خط پہونچ گیا مگر وہ دوبار مجھکو لکھ چکا ہے کہ مَیں جواب اسکا نشان مرقومہ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں جواب الجواب کا منتظر ہوں آپ جانتے ہیں کہ کمالِ یاس مستثنی استغنا ہے پس اب

اِس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامیدِ مرگ جیتا ہوں اِس راہ سے کچھ
مستغنی ہوتا چلا ہوں دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گذر
جائیگی جانتا ہوں کہ تمکو ہنسی آئیگی کہ یہ کیا بکتا ہے مرنے کا زمانہ
کون بتا سکتا ہے چاہئے الہام سمجھئے چاہئے اوہام سمجھئے بیس برس سے
یہ قطعہ لکھ رکھا ہے ؎

منکہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند وطالب مُرد
در بگویند در کدامی سال — مُرد غالب بگو کہ غالب مُرد

اب بارہ سو چھتر ہیں اور غالب مُرد کے بارہ سو ستتر ہیں اِس
عرصے میں جو کچھ مسرت پہونچنی ہو پہونچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔

سوالات

۱۔ پینے کو کچھ میسّر نہیں " میں کیا کیا نکات ہیں۔؟
۲۔ غالب کو اپنے مرنے کا پہلے سے کیوں یقین تھا۔؟

ایضاً

پیرو مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے
کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا خلاصہ عرض کا یہ ہے کہ آج شہر میں
بدر الدین علی خاں کا نظیر نہیں پس مُہر اور کون کھود سکیگا ناچار
میں نے آپکا نوازشنامہ جو میرے نام تھا وہ اُن کے پاس بھیجدیا۔
انھوں نے رقعہ میرے نام کا آج بھیجا سو وہ رقعہ حضرت کی خدمت
میں بھیجتا ہوں میں نہیں سمجھتا کہ قسم دوم کا اخراج کی کیا ہے آپ
اس کو سمجھ لیں اور لکھیں باحتیاط ارسال آدھے روپیہ کے بھیجنے کی
ابھی ضرورت نہیں ہے جب میں عرض کروں تب بھیجئے گا تعجب ہے

کہ جناب میر امجد علی صاحب قلق کا اس خط میں سلام نہ لکھنا۔ متوقع ہوں کہ چھاپے کے قصیدے اُن کو سُنائے جائیں اور میری بندگی کہی جائے۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو میرا سلام بعد ہزار اشتیاق پہونچے۔

سوالات

۱۔ خط کا خلاصہ مطلب تحریر کرو۔؟

بنام حکیم سیّد احمد حسَن صاحب مودودی

حضرت قبلہ! پہلے التماس یہ ہے کہ آپ سیّد صحیح النسب تمام اُمّت محمّدیہ کے قبلہ و کعبہ۔ جب آپ مجکو قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپکو کیا لکھوں۔ خدا کے واسطے غور کیجئے کہ قبلۂ قبلہ اور کعبۂ کعبہ یہ کیا ترکیب ہے چونکہ آپ نے مجھے اُستاد گردانا ہے اِس التماس کو بھی از قسم اصلاح تصوّر کیجئے۔ زنہار۔ قبلۂ قبلہ کبھی نہ لکھئے گا۔ یہ سوءِ ادب ہے۔ بہ نسبت قبلہ۔ خدا کی پناہ۔

آپکا عطوفت نامہ پہونچا۔ میرے پہلے خط کا بدیر پہونچنا اور اُس کی دیر رسی کا سبب مجھکو معلوم ہوا۔ اب اِس کا خیال رکھونگا۔ یہ اب آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمہ باقی نہیں ہے۔ جس خط کا جواب نہیں پہونچا اُس کو یہ سمجھئے کہ وہ راہ میں تلف ہوئے اور میرے پاس نہیں پہونچے۔ فقط

(غالب ۱۹۔ ذی الحجہ)

سوالات

۱۔ مصنف نے القاب کے متعلق اپنی کسر نفسی کس پیرایے میں ظاہر فرمائی ہے۔!

۲۔ جواب خط کے متعلق مصنف نے کیا حاضر جوابی کی ہے۔؟

رقعات منشی غلام غوث بیخبر

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خط کا جواب

حضرت! خدا گواہ اور محبت شاہد ہے کہ ہمیشہ آپ کے خطوں کے لئے اپنا جی تڑپا کیا اکثر آپ کو یہ لکھنا چاہا کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھ سے تو سلسلۂ تحریر قطع نہ کیجئے اس محبت کو تا دمِ آخر نباہ دیجئے۔ لیکن آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر بعضوں سے سنا کہ اب آپ نے اپنے خدام سے فرما دیا ہے کہ کوئی کاغذ ہو مجھے دکھایا ہی نکرو اس سبب سے تحریر پر جرأت نہ کرسکا۔ دل پر جبر کرکے بیٹھ رہا۔ اب جو آپکا عنایت نامہ آیا کہیں کہہ سکتا کہ کیسی خوشی ہوئی۔ دولت ملتی سلطنت ہاتھ آتی تو بھی شاید اتنی خوشی نہوتی۔ اِن چند سطروں کو بار بار پڑھا کیا دیر تک ایک کیفیت قلب پر طاری رہی جو بیان میں نہیں آسکتی قسموں کی کیا حاجت ہے اگر اتنا بھی معلوم ہو کہ میرے دس خط کا ایک جواب آئیگا تو حضرت کے دیوانخانے کا طاقچہ میرے خطوں سے بھر جائیگا

آپ کو کسے عالم کا خیال آیا ہوگا جو مساعدت روزگار سے استفسار ہے۔ عالم ان کی تلونیوں میں شک نہیں۔ مگر طالع تو وہی پرانا ہے کیا عرض کروں میرے حال نے فلسفیوں کا کلیہ باطل کردیا۔ کہ باوجود حادث ہونے کے متغیر نہیں۔ اس سال رزیڈنٹ کا دورہ ہوتا ہے۔ کل تک لشکر رامپور کے علاقے میں تھا۔ آج دہلی کی حد میں داخل ہوا۔ زندگی باقی ہے تو پانچویں فروری کو یہ دورہ ختم ہوگا

اور الہ آباد پہونچیں گے۔

سوالات

۱۔ کاتب نے مکتوب الیہ کے خطوط کے متعلق اپنا اشتیاق کس طرح سے ظاہر کیا ہے۔؟
۲۔ مصنف نے اپنی یقینی بدقسمتی کو کس پیرایے میں ظاہر کیا ہے۔؟
۳۔ مصنف نے دورے کی کیا خبر دی ہے۔؟

حکیم وجیہ الدین صاحب کے خط کا جواب

ملتِ عاشق ز ملتہا جداست۔ سُنئے حکیم صاحب۔ فقیر کا مشرب اکثر امور بلکہ خدا جھوٹ نہ بُلائے تو سارے معاملات میں اربابِ زمانہ کے مشرب سے جدا ہے۔ میرے ہاتھ سے اگر کسی کو کچھ پہونچتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُس کی امانت میرے پاس تھی میں نے پہونچادی۔ اور بہت شکر کرتا ہوں کہ اُس خدائے کریم نے آپ دیا اور میرے ہاتھوں سے دلوا کے مُفت میں مجھے نیکنام کیا۔ اگر کسی اور کے ذریعے سے دلواتا اور یہ نیکنامی اُس کے حصّے میں جاتی تو میرا کیا زور تھا۔ یہ ہرگز نہیں تصوّر کرتا کہ میں نے احسان کیا۔ احسان کا تو جب خیال کروں کہ میں اپنے پاس سے کچھ دوں۔ اپنے پاس سے جب دوں کہ کوئی چیز میرے مِلک میں ہو۔ میں دُنیا کی کسی شے کو اپنی نہیں جانتا۔ اور کیونکر جانوں کوئی چیز میری ہوتی تو عدم سے آتے وقت ساتھ لایا ہوتا۔ دنیا سے جاتے وقت ساتھ لیتا جاتا۔ نہ وہ ہوا نہ یہ ہوگا۔ پھر یہ مِلک کیسی اور میں مالک کیسا۔ کچھ نہیں جو یہاں کی چیزوں کو اپنا جانتے ہیں بڑی غلطی میں پڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چند روز جو اِس عالم کی سیر کی اجازت ہوئی ہے رفع ضرورت کے لئے کچھ چیزیں بھی

عاریت دیدی گئی ہیں۔ مالک کو اختیار ہے۔ جب جو چاہے اُس میں سے دوسرے کو دلوادے۔ ہمیں اُس میں کیا دخل۔ فرد

در حقیقت ہمہ زملک خداست چند روزے بعاریت باماست

اِس سرا کو گھر سمجھیں۔ یہاں کی مستعار چیزوں کو ملک قرار دیں۔ اُس بے اختیاری کو جو اُس کے دینے میں ہے اختیار تصوُّر کریں پھر اُس کا احسان رکھیں۔ لاحول ولا قوۃ ع۔ بریں عقل و دانش ببابد گریست دعا کیجیے کہ خدا انجام کار تک فقیر کی سمجھ کو ایسی ہی رکھے۔ اور نفس کے دھوکے سے بچائے۔

سوالات

۱۔ احسان کے متعلق مصنف کی کیا رائے ہے۔؟
۲۔ دنیا کو ناپائدار ثابت کرنے میں مصنف نے کیا نازک خیالی کی ہے۔؟

راے سالگ رام صاحب انسپکٹر کے نام

مظہرِ الطاف و کرم سلامت جب یہ امر متحقق ہے کہ عالمِ ارواح میں روحوں سے باہمدیگر ملاقات ہوتی ہے تو میں یہ کیوں کہوں کہ میرے آپ کے سابق کی ملاقات نہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ جب تک عالمِ اجسام میں ظہور اسکا نہو تب تک کسی کو کسی بات کی تکلیف دینی بےموقع ہے اس کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔ مگر عالمِ اسباب میں بعض وقت ایسے سبب جمع ہوجاتے ہیں کہ وہ بے مراسم ظاہری بھی تکلیف دینے پر جرأت دلاتے ہیں۔ منجملہ اِن پر جرأت دلانے والے دو امر ہیں۔ ایک آپ کا صوفی مشرب ہونا۔ چونکہ میں بھی ابتداسے نظر سے حضرات صوفیہ کا خادم ہوں، یہ مناسبت اپنے میں اور آپ میں

ایسی پاتا ہوں کہ سارے تکلفات کو قطع نظر کرنے کے لئے کافی ہے۔
دوسرا یہ خیال کہ جب آپ کو خط دیکھکر یہ تصوّر ہوگا کہ ظاہر کی شناسائی
نہیں اور تکلیف دیتا ہے تو میری سادہ دلی پر رحم آجائے گا۔ اور
وہ رحم میرے مقصد کے بر لانے میں برسوں کی ملاقات سے زیادہ
کام آئے گا۔ پھر بے تکلف آپ کو تکلیف کیوں ندوں۔ اس لئے
گزارش کرتا ہوں کہ آپ کو یاد ہوگا ابھی چند مہینے ہوئے جب
آپ الہ آباد تشریف لائے تھے تو مرزا نثار علی بیگ صاحب نے آپ سے
اس کی سفارش کی تھی کہ امین الدین خاں صاحب سب انسپکٹر کو
فتحپور سے الہ آباد بدل دیجئے۔ اور آپ نے وعدہ فرمایا تھا اگرچہ مرزا
صاحب بھی مثل میرے خانصاحب کے دوست ہیں۔ لیکن محرک اسکے
میرا ہی تحریک سے ہوئے تھے۔ اب میں بلا واسطہ ملتمس ہوں کہ
اپنے وعدے کو وفا فرمائیے۔ اس عطا میں زیادہ لطف ہے۔ جو
بے تکلیف استفسار ملے۔ آپ سے میں اسی کا خواستگار ہوں۔ اور
کیوں نہوں کہ ارباب کرم کے نزدیک یہ کچھ دشوار نہیں۔ اگر
تھوڑا سا وقت آپ اس تحریر کے جواب میں بھی ضائع فرمائیں گے۔
تو میں اس کا بھی شکر گزار ہونگا۔

سوالات

۱۔ کاتب نے مکتوب الیہ سے باوجود پہلی ملاقات نہونے کے کس اسلوب سے قدیمی تعلقات
ظاہر کئے ہیں۔؟

۲۔ اس عطا میں زیادہ لطف ہے جو بے تکلیف استفسار ملے سے کیا مراد ہے۔؟

منشی محمد اکرام حسین صاحب منصرم کلکٹری کے نام

مخدوم میرے اگرچہ حاجت روائی خلق اللہ کی ہے تو بہت اچھی بات کہ انسان دنیا میں نیکنام ہوتا ہے۔ عقبیٰ میں مغفرت سے شاد کام ہوتا ہے۔ ہر شخص اُس کی مدح کرتا ہے۔ ہر ایک اُسی کا دم بھرتا ہے۔ بے کوڑی پیسہ خرچ کیے فدائیوں کا لشکر اُس کے لیے تیار رہتا ہے۔ جب تک جہاں رہے سب عزیز رکھتے ہیں۔ کہیں چلا جائے تو بخیر یاد کرتے ہیں۔ لوگ رنج و راحت میں اُس کے شریک ہوتے ہیں۔ جو کہ ظاہر میں دور ہوں وہ بھی دل سے نزدیک ہوتے ہیں۔ جیسے کہ آپ ہیں۔ اور لطف بھی دنیا میں رہنے کا یہی ہے کہ سویدا کی طرح لوگوں کے دل میں رہے سب کی آنکھوں میں جگہ پائے۔ نگار کی صورت تل میں رہے مگر برائی اس میں ہے تو یہ ہے کہ لوگ تنگ بہت کرتے ہیں انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑتے ہیں جس کا ایک کام کردیا وہ دوسرا کام پیش کرتا ہے۔ ہر وقت ایک نئی طرح کی تکلیف دیتا ہے جیسا کہ میں ہوں کہ آج پھر آپ کو کچھ تصدیع دیتا ہوں۔ اس اجمال کی یہ تفصیل ہے کہ میاں محمد سعید میرے ایک دوست اُس ضلع کی پولیس میں نوکر ہیں بہت دنوں سے اُن کی شادی ٹھہری ہے۔ دونوں طرف سارا سامان مہیا ہے۔ اُنھیں کسی طرح رخصت نہیں ملتی۔ اگر آپ وہاں کے صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر سے اتنا کام لیں کہ اُنکو دو مہینے کی رخصت بلا عوض یا بعوض تنخواہ مل سکے دلا دیں تو کمال آپکا احسان ہوگا۔

سوالات

۱۔ حاجت روائی خلق اللہ کے نتائج بیان کرو اس کے فوائد اور نقصانات کی تفصیل کرو۔

قاضی نجم الدین صاحب برق کے خط کا جواب

ساری ہستی حباب کی سی ہے　　یہ نمائش سراب کی سی ہے

آج صبح کو کہ شام غم اسے کہوں تو بجا ہے آپکا خط آیا۔ کیا لکھوں دل نے کیا صدمہ اُٹھایا مجھے اس سرگذشت کے تصور سے رنج و الم ہے۔ آپ پر گذری ہے جو کچھ آپ کی حالت ہو کم ہے۔ کوئی نا سمجھ ہو تو اُسے سمجھاؤں کہ دنیا ناپائدار ہے۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے ہم سب اس بزم میں اسی لئے جمع کئے گئے ہیں کہ پریشان ہوں۔ ایک کا حال دوسرے کے لئے آئینہ ہے۔ پھر کیونکر نہ حیران ہوں۔ غفلت ہم لوگوں کا شعار ہے۔ اور جو سچ پوچھئے تو اس میں بھی کچھ اپنا قصور نہیں۔ اس کارخانے کا اسی پر مدار ہے۔ ورنہ سوچیں تو دنیا ایک طلسمات کی سرا ہے۔ مسافر اس میں پس و پیش آتے ہیں اور ویسے ہی اپنے اپنے وقت پر چلے جاتے ہیں۔ چند ساعت جو دم لینے کے لئے ٹھہرتے ہیں تو عبث کن کن جھگڑوں میں پڑتے ہیں ناحق کے لاکھوں تعلق ہیں کروروں افکار ہیں اعتبارات کو حقیقت سمجھ لیا ہے اسی سے مبتلائے آزار ہیں۔ جاننے والے جو دام غفلت سے نکل جاتے ہیں پھر وہ ہمیں مڑکر نہیں دیکھتے کہ ان کا کیا حال ہے۔ ہم جب تک اس میں پھنسے ہیں مجبور ہیں ہمیں ان کا رنج ہے ملال ہے۔ آپ تو خود سمجھدار ہیں۔ دوسرا اور کو سمجھا سکتے ہیں آپ کو کیا سمجھاؤں۔ ہاں دعا کرتا ہوں کہ پروردگار مرحومہ کو حضرت خاتون جنت کے جوار میں جگہ دے۔ آپ کو توفیق صبر عطا کرے۔ لڑکی کی عمر دراز ہو کہ وہ سونی مٹی کی نشانی ہے۔ پس

ماندوں کے لئے مرہم زخم جاودانی ہے۔

سوالات

۱۔ مصنف نے دنیا کی ناپائداری کے لئے کیا دلائل پیش کئے ہیں۔؟
۲۔ تلقین صبر کے لئے مصنف نے کیا تحریر کیا ہے۔؟

نواب محسن الملک کے بھائی کی تعزیت میں

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ اللہ اکبر پہلو میں جگر ہے یا پتھر کہ جس کے غسل کی تہنیت لکھنے کا منتظر تھا اُس کی تعزیت لکھنے بیٹھا ہوں اور قلم ہاتھ سے گر نہیں پڑتا۔ سینے میں دل ہے یا فولاد کہ زمزمۂ شادی کی جگہ نوحۂ غم لب پر لاتا ہوں اور اُس کے خون ہوکر بہ جانے سے نہیں ڈرتا۔ بھائی اور جوان اور ذی استعداد اور خوش لیاقت۔ ایسے کے مرنے میں کیونکر لکھوں کہ رنج اختیار نفرمائیے۔ دلپر جبر کیجئے۔ مرنے والے کی اتنی باتوں سے کس کس بات پر کہوں کہ بے صبری اچھی نہیں صبر کیجئے۔ اِس حادثہ کا جسقدر آپ کو الم تمہ کم ہے۔ تمام عمر جو دلکو چین نہ لینے دے وہ ماتم ہے۔ مگر کیا کہوں اگر یہ نہ کہوں کہ گریۂ و بکا بے سود ہے۔ جی مانے یا نہ مانے تسلیم و رضا ہی میں بہبود ہے۔ اور میں کیا کہوں آپ خود جانتے ہیں کہ دنیا فانوسِ خیالی ہے انسان اِس میں مثلِ تصویرِ کاغذی ہر امر میں اپنے اختیار سے خالی ہے۔ جسے زندگی کہتے ہیں وہ ایک حرکت اضطراری ہے۔ اور جسے موت جانتے ہیں وہ ایک سکونِ بے اختیاری ہے۔ جب یہ حال ہو تو جینا مرنا سب ایک سا ہے۔ تصویر کو تصویر کا غم کتنا بیجا ہے۔ اگر اصل حقیقت پر آدمی کی نظر ہو تو

پھر کیوں ایک کے لیئے دوسرا خاک بسر ہو لیکن ہاں انصاف یہ ہے کہ اس میں بھی کچھ اپنا بس نہیں چلتا۔ اس طلسم غفلت کا اثر ایسا غالب ہے کہ دل سے ہرگز نہیں نکلتا۔ بہرکیف اب یہ دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت ہو اور اُس کے بعد جو کچھ آپ کو پیش آئے وہ سب عیش و عشرت ہو۔ فقط

سوالات

۱۔ مصنف نے تلقین صبر۔ اظہار افسوس۔ ناپائداری دنیا اور دعائے مرحوم کے لئے کیا کیا پیرائے اختیار کئے ہیں۔؟

قصائد

قصیدہ۔ لغت میں قصیدہ کے معنی ہیں کسی شخص یا چیز کی جانب متوجہ ہونا۔ چونکہ قصیدہ میں شاعر کا مقصود کوئی خاص شخص یا چیز ہوتی ہے جس کی بھلائی یا برائی کرتا ہے اس لیئے اُس کو قصیدہ کہتے ہیں۔ قصیدہ میں اگر بھلائی یا برائی سے پہلے کوئی تمہید ممدوح کے حال کے موافق ہو تو اُس کو **تمہیدیہ** کہتے ہیں اور اگر شروع ہی سے تعریف شروع کردیجائے تو اُس کو **خطابیہ** کہتے ہیں۔ قصیدہ یا غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہو اُس کو **مطلع** کہتے ہیں۔ مطلع کبھی ایک ہوتا ہے کبھی دو یا زائد۔ اور مطلع کے بعد کے شعر کو **حُسن مطلع** اور شعر آخر کو جس میں شاعر اپنا تخلص رکھتا ہے **مقطع** کہتے ہیں۔ **قصیدۂ تمہیدیہ** کے اُس شعر کو جس سے ممدوح کی تعریف کی جانب رجوع کریں **گریز** یا **تخلص** کہتے ہیں اور اُس تمہید کو **تشبیب**۔ جو الفاظ حرکات سکنات وزن تعداد حروف میں یکساں ہوں اُنکو **قافیہ** اور جو تمام اشعار کے آخر میں مکرر آئے۔ اُسکو **ردیف** کہتے ہیں۔

حمد باری تعالےٰ

ہر جا ہے تیرا جلوہ لیکن دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا

یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو پایا ہر شے میں پر نہ پایا

اللہ رے تیری بے نیازی یعقوب کو مدتوں رلایا

یوسف سے عزیز کو کئی سال زندانِ عزیز میں پھنسایا

یاں شعلہ کو سرکشی کی کیا تاب ابلیس کو خاک میں ملایا

تجکو ہی سزا ہے کبریائی کرسی کا نہ عرش کا یہ پایا

تو واحد و بے نظیر و ہمتا تو حاکم و خالق برایا

تجکو بھی نہ کہہ سکیں ترا مثل یاں تک نقشِ دوئی مٹایا

یعنی وہ فنا ازل سے ہے اور اس ذات کو کب زوال آیا

آوے تیری حمد کا تو ہم ہم یہ حوصلہ میں کہاں سے لایا

کیا صعب گذار ہے رہِ حمد جبریل کا پاؤں لڑکھڑایا

چکر میں ہے عقلِ عرشِ اعظم اس نے بھی مگر تجھے نہ پایا

مومن ہے زمانِ عرضِ احوال یعنی تجھے بے خرد جتایا

رو رو کے دعا کر اک ذرا دیکھ کیا ابرِ کرم ہے سر پہ چھایا

اللہ مرے گناہِ بیحد وہ ہیں کہ شمار کو تھکایا

ہے عام خطاب یا عبادی اس نے تو کچھ آسرا بندھایا

عالم میں نہ ہوئیگا وگر نہ مجھ سا کوئی منکر السجایا

کیونکر نہو تیری آس تونے افلاک کو بے ستوں تھمایا

مجکو بھی بچائے جیسے تونے یوسف کو گناہ سے بچایا

وہ رفعتِ حال دے کہ جسنے منصور کو دار پر چڑھایا

اسکا مرے دل پہ ایک پرتو جس شعلہ نے طور کو جلایا

مومن کہے کس سے حال آخر ہے کون ترے سوا خدایا

زمانہ کا انقلاب

یاد ایّامِ عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
ایسے وحشت سرا میں آئے کون — بے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں — کہ میں شہری ہوں یا بیابانی
کیا ہوئی وہ بلندیِ دیوار — کیا ہوئے وہ عمادِ طولانی
مٹ گئے حوض و نہر غیر از چشم — ایک قطرہ کہیں نہیں پانی
نہ ملا کچھ نشانِ آبِ رواں — خاک سارے جہاں کی چھانی
سقفِ رنگین و زرنگار کہاں — جز سپہر و نجوم نورانی
شورِ زاغ و زغن ہے سمع خراش — اب کہاں بلبل و غزلخوانی
صرفِ دلقِ گدا ہوئے پردے — زینت افزائے کاخِ سلطانی
آپ کا شانہ فرشِ خاک ہوا — کیسے قالیچہ ہائے کاشانی
یا نخوت و سماطت مجھے تھا — دعویِ قیصریؔ و خاقانی
یا نہیں ہے مرقّع و کشکول — تا کروں تازہ رسمِ ساسانی
مسندِ گوہریں کا دھیان آیا — پوچھتے کیا ہو وجہِ گریانی
بالشِ سنگ و خوابِ واویلا — یا بہ خاطر ہوئی گراں جانی
یا یہاں پرنیاں و اطلس ہے — جلوہ گر تھی سپہرِ سامانی
یا یہ احوال ہے کہ چاک ہوا — تنگیوں سے لباسِ عریانی
اس چمن زار کو خزاں ہے ضرور — مَیں نے کیا تہ کی بات پہچانی

(مومن)

قصیدہ مدحیہ

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں
کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

دیکھے نہ اِس طرح کا تماشا جہاں میں
گر ہو تمام چشم تماشاگر آسماں

اترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے
سچ ہے زمیں پہ پانوں رکھے کیونکر آسماں

افراط انبساط سے ہے کیا عجب اگر
مثلِ حباب جامہ سے ہو باہر آسماں

شادی کی اُسکی دھوم ہے آج آسماں تلک
تابع زمانہ جسکا ہے فرماں بر آسماں

فرزندِ شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار
تسلیم کو ہے جسکے جھکاتا سر آسماں

ہے اُس کی بارگاہ میں مانندِ چوبدار
حاضر عصائے کاہکشاں لیکر آسماں

اِس بیاہ کی نوید سے ہے اس قدر مسرور
ہے پیر پر جواں سے ہے بہتر آسماں

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
مقدور کیا ہے ٹھہر سکے دم بھر آسماں

فردِ حسابِ صرف سے اِس بیاہ کے ہو کم
گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں

ابرِ بہار و دودِ چراغاں سے تو بہ تو
ہوں سات آسماں کی جگہ ستر آسماں

چشمِ قمر میں اور بھی ہو روشنی دوچند
کاجل لگائے اُسکے دھوئیں سے گر آسماں

کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار
شبنم کی جائے صبح تلک گوہر آسماں

پہونچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو
انجم سے لاکھ جمع کرے لشکر آسماں

جس وقت سہرہ باندھکے دولھا چلا سوار
کیا کیا بلائیں لیتا تھا جھک جھک کر آسماں

ایسا نہیں جہاں میں کوئی نخلِ آرزو
لایا ہو آج جس میں نہ برگ و بر آسماں

کرتا ہے شاخِ خشک تمنا کو نخلِ سبز
در پردہ مثل مہرہ بازیگر آسماں

شادی کا اُس کے نورِ بصر کے ہے اہتمام
کرتا ہے جس کا روز طوافِ در آسماں

وہ شاہ نامور کہ بہادر شہ اُسکا نام
ہو حکم سے نہ اُس کے کبھی باہر آسماں

مطلع پڑھوں حضور میں وہ میں جیسے کہے — مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

مطلع

تجھ سا زمیں پہ دیکھے جو فرخ فر آسماں — قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھر کے آسماں
طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع — کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں
ہے آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر — جس طرح کوہسار سے بالا تر آسماں
وہ بحرِ بیکراں ہے تری ہمتِ وسیع — ہے بلبلا سا ایک کنارے پہ آسماں
دریار قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا — بہ جائے مثلِ کشتیِ بے لنگر آسماں
قد پہ ترے وہ راست قبائے علوِ جاہ — زیبندہ جس کے واسطے بالا بر آسماں
تیری گہر فشانیِ دستِ کرم سے ہے — گویا کہ ایک دامنِ پُر گوہر آسماں
یوں دل میں ہیں ترے جلوۂ ذاتِ محیطِ حق — آجائے جیسے آئینہ کے اندر آسماں
یہ ذوق کی دعا ہے کہ جبتک زمانے میں — منسوب ہر ستارے سے ہووے ہر آسماں
بزمِ نشاط و عیش رہے تیرے گھر میں روز — لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسماں
مارے جگر میں حاسدِ بدخواہ کے ترے — تارِ خطوطِ مہر سے نشتر آسماں

(ذوق)

قصیدۂ رحیم

ہیں مری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر — ایک گر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر
نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفا — تہِ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر
رزق تو در خورِ خواہش ہے پہونچتا سب کو — مرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر
پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت — غرق ہے آب میں پر تر نہیں ہوتا گوہر
ہے دلِ صاف کو عزلت ہی میں گھر وقتِ عباد — گرد آلود نہیں ہوتا تنہا گوہر

کور باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت / کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر
غیر پُرمایہ نہ کم مایہ سے ہو ضبطِ ہوس / بہ گیا ژالہ ہوا گَل کے نہ پگلا گوہر
ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد / ہو نہ ہم صحبت تارِ رگ خارا گوہر
دلخراش اور ہے طاقت وہ دل ہے کچھ اور / کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر
فیض کو عالمِ بالا کے ہے شرط استعداد / قطرہ یکجا ہے ملا شیر ہے یکجا گوہر
صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کی ہے شرطِ نظر / کور کیا جانے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر
صافِ باطن کی ہو جب قدر کہ ظاہر ہو درست / سول بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر
ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خویش جوہر کی / تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر
ذوق موقوف کر اندازِ غزل خوانی کو / ڈھونڈھ اِس بحر میں اب تو کوئی اچھا گوہر
غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر / آگے تقدیر سے خرمہرہ ملے یا گوہر
اثرِ مدح سے اُس خسروِ دریا دل کے / کر سخن قابلِ گوشِ دلِ دانا گوہر
وہ بہادر شہ غازی کہ برنگِ نیساں / روز برسائے ہے ابرِ کرم اُس کا گوہر
جشن سے اُس کے ہے اک فیض کا دریا جاری / بیتے پھرتے ہیں برنگِ کفِ دریا گوہر
زیور آرا ہوں اگر آج چمن میں گل و سرو / بیضۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر
پہونچے گر گوشِ صدف تک یہ نویدِ عشرت / آتنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر
موجِ گوہر میں بھی ہے طرزِ تبسم پیدا / کوئی دم میں روشِ غنچہ ہنسے گا گوہر
مدحِ حاضر میں کروں میں کوئی مطلع تحریر / آج ہے خامہ مرا منہ سے اگلتا گوہر

مطلع

آج وہ دن ہے کہ اے خسروِ والا گوہر / گو وہ دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر
بحر و بر میں ہے شہا تیرے عطیات نثار / یم سے زر تلک اور لعل سے لےتا گوہر

ہو ترے فیضِ قدم سے جو زمیں گوہر خیز — ہو نصیبہ صدفِ نقشِ کفِ پا گوہر

مشتری کہتے ہیں جسکو وہ اٹھا لایا چرخ — ٹوٹ کر جو تری سمرن سے گرا تھا گوہر

صبحِ اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا — جو ترے طرۂ دستار کا چمکا گوہر

پرورش دیوے چمن کو جو ترا ابرِ کرم — ہو تماں میں عوضِ غنچہ ہو پیدا گوہر

ماہ گہنے کے لیے ہے نہ کہ گہنے کے لیے — تیرے کنٹھے کا کہوں کیا اُسے زیبا گوہر

دُرِ مشتاق سے تری اِتنے گہر ہیں ارزاں — لکھتے ہیں نسخۂ مفلس میں اطبّا گوہر

کوہ کا زہرہ کرے آب تری ہیبتِ عدل — گر یہ سُن پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر

آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب — ابرِ مُردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

آج محفل میں تری وہ گہر افشانی ہے — لگنِ شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر

تیرے دورانِ حفاظت میں کہاں بچ وگزند — حق میں بیمار کے تبخالہ ہے لب کا گوہر

سینہ صافی کا ترے ایک ہے نقشہ دریا — دل روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر

خسروا میں جو کہوں سب ترے اوصاف تجکو — تو سدا مُنھ سے مرے پھول جھڑیں یا گوہر

ذوقؔ کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن — تا کہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر

جب تلک جوشِ بہاراں سے ہو لے دم صبح — ٹانکے شبنم سے سرِ دامنِ صحرا گوہر

ہر برس جشن ترا تجھکو مبارک ہووے — برسیں نیسانِ کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنجِ گہر روز نصیب — ہو نہ جز اشک سرِ دامنِ اعدا گوہر

(ذوقؔ)

قصیدہ

سپاہِ اشک کی آنکھوں نے کی ہے تیّاری — کہو کہ نیزۂ مژگاں کرے علمداری

ہجومِ غم کا ہوا نیند ہو گئی پامال — وہ آنکھوں میں نہیں طالع میں تھی جو بیداری

نگاہ دل میں ہے یوں صورتِ جہانِ سیاہ — کسی مریض پہ جس طرح رات ہو بھاری

زمانہ آپ کو شاہد حسیں سمجھتا ہے　کہ جانتا ہے سبب فخر کا دل آزاری

پڑے ہیں جو داغ کسی دل میں یادگار مجھے　کہے کہ نہر رواں ہے جو اشک ہوں جاری

عدم کو جاتے ہیں رہتی ہے قافلے کیا کیا　یہ شاہراہ شب و روز رہتی ہے جاری

ہر اک سوار ہے پا در رکاب عالم میں　سمند عمر میں کتنی ہے تیز رفتاری

جو دن کو مرتے ہیں ہر شام آنکے ماتم کیا　پہن کے آتی ہے شب جامۂ عزاداری

اجل سے کوئی رہے تن میں کس طرح محفوظ　نہیں ہے قلعۂ آہن یہ چار دیواری

بجا ہے گرم کچہری جو ایسی موت کی ہے　کیا ہے منشی تقدیر نے قلم جاری

امید زال جہاں سے عبث ہے الفت کی　یہ بیوہ جانتی ہے شیوۂ جگر خواری

اٹھا ہے آب دم تیغ مرگ کا طوفاں　جو ایک ڈوب چکا دوسرے کی ہے باری

ادھر تو تیر ادھر تیغ تن پہ پڑتی ہے　کہاں کہاں کی بھلا ہو سکے خبرداری

ادھر مکان بنا اس طرف مزار کھدا　ادھر لباس ادھر ہے کفن کی طیاری

سحر ہوئی ہے کھلا ہے سرا کا دروازہ　مسافروں سے کہو کوچ کی ہے تیاری

وہ خوش خرام ہوئے خاک جن کے ماتم میں　زمیں پہ سر کو پٹکتی ہے کبک کہساری

وہ برق وش ہوئے آزار کھینچکر معدوم　کہ جنکی خاک پہ روتا ہے ابر آذاری

لحد میں اسپہ پڑا بوجھ سیکڑوں من کا　کسی کی جن سے نہوتی تھی ناز برداری

زمیں نے ایک جہاں دام مکر میں کھینچا　لحد نہیں یہ ہے زنبیل بہر عیاری

کہاں وہ تاج فریدوں کی تھی جو آرائش　کہاں وہ تخت سلیماں کی تھی جو طیاری

کہاں وہ عیش زلیخا کہاں وہ شاہی مصر　کہاں وہ حضرت یوسف کی گرم بازاری

کہو کہ آئیں نہ اس کے فریب میں غافل　کہ باغ سبز دکھاتا ہے چرخ زنگاری

یہی حقیقت دنیا ہے لوٹتے کیا دنیا　کسی سے کی نہ کرے گی کبھی وفاداری

ہوا تھی جن کے لئے غفلت زمین و زماں　وہی جہاں سے گئے پیش حضرت باری

مسافر اس میں رواں ہیں آنکھ بند کئے — عدم کی راہ میں دیکھو ہے کتنی ہموار ی

(امیر مینائی)

غزلیات

غزل لغت میں عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں اُن مجموعۂ اشعار کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق وصل و فراق اور عشق و محبت کے لوازمات کا بیان ہو۔ لیکن اب شعرا نے اس میں اور وسعت دیکر اخلاق اور تصوف و مواعظ و جذباتِ قلبیہ کو بھی شامل کرلیا ہے۔ غزل میں مضامین مسلسل نہیں ہوتے ہر شعر کا مضمون جداگانہ ہوتا ہے۔ بعض شعرا نے مسلسل مضمون کی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ غزل کے اشعار کم سے کم ۵ ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ۱۱ مگر متاخرین نے ۱۷ سے زائد اشعار بھی غزل میں لکھے ہیں۔

میر محمد تقی میر

بے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا — بلبل نے کیا سمجھکر یاں آشیاں بنایا

اُڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں — کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا

ہر رنگ پر نہ ہنایاں کا عجب نہیں ہے — کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا

آئینے میں کہاں ہے ایسی صفا کہے تو — جبہوں سے راستوں کے وہ آستاں بنایا

اس صحن پر یہ وسعت اللہ ری تیری صنعت — معمار نے فضا کے دل کیا مکاں بنایا

دریوزہ کرتے گذری گلیوں میں عمر اپنی — درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا

وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جی کی — دوچار اینٹیں رکھکر پھر یاں نشاں بنایا

۲

آرام ہو چکا مرے جسمِ نزار کو — رکھے خدا جہاں میں دلِ بیقرار کو

پانی یہ جیسے غنچۂ لالہ بھرے بہا — دیکھا میں آنسوؤں میں دلِ داغدار کو

برسا تو میرے دیدۂ خونبار کے حضور — ورنہ اب تک انفعال ہے ابرِ بہار کو

ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار — پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو

سرگشتگی سوائے ندیکھا جہاں میں کچھ — یک عمرِ خضر سیر کیا اس دیار کو
کس کسکی خاک اُنکی ملاقی ہے خاک میں — جاتی ہے پھر نسیم اُسی رہگذار کو
اے وہ کوئی جو آج پیے ہے شراب عیش — خاطر میں رکھیو کل کے بھی رنجِ خمار کو
جیتے جی فکر خوب ہے ورنہ یہ بدبلا — رکھیگا حشر تک تہ و بالا مزار کو

۳

اس باغ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے — کیا کیا نہال دیکھتے یاں پانوں آ لگے
حرص و ہوس سے باز رہے دل تو خوب ہے — ہے قہر اس گل کے تئیں گر ہوا لگے
داغ اب تو اپنے جی کو یہی لگتی ہے اس نمط — جیسے کسو کے زخم پہ تیر اک دوا لگے
کسکو خبر ہو کشتی تباہوں کے حال کی — تختہ مگر کنارے کوئی بہ کے جا لگے
مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک — عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے
سب چاہتے ہیں دیر رہے میر دل زدہ — یارب کسو تو دوست کی اس کو دعا لگے

۴

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا — کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
سرسری تم جہان سے گذرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
اب خرابہ ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا — میر معلوم ہے قلندر تھا

خواجہ میر درد

کھلا دروازہ میرے دل پہ از بس اور عالم کا — نہ اندیشہ ہے شادی کا مجھے نے فکر ہے غم کا
بلند و پست سب ہموار ہیں اپنی نگاہوں میں — برابر ساز میں ہوتا ہے جوں تار زیر اور بم کا
گلستانِ جہاں کی دید کیجیو چشمِ عبرت سے — کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخلِ ماتم کا

چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل — گلو ننگے نگہ پہ یوں چڑھتی ہے دیدۂ شبنم کا
نہیں مذکور شاہاں درد ہرگز اپنی مجلس میں — کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادہم کا

۲

نہ ہاتھ اٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے — کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے
نہیں خیال مجھے خاتمِ سلیماں کا — برنگِ نام ہوں برکندہ دل نگینے سے
بسانِ دانۂ انگور مے پرستوں نے — لیا ہے فیض مرے دل کے آبگینے سے
ترقی اور تنزل کو یاں کے کچھ عرصہ — مثالِ ماہ زیادہ نہیں مہینے سے
مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جاوے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے
مآلِ کار سو چھایا قصور نے ہمکو — یہ نقدِ مال لگا ہاتھ اس دفینے سے
بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے درد — کہ بو گلاب کی آتی ہے تیرے پسینے سے

۳

فرض کیا کرائے ہوس اک دو قدم ہی باغ ہے — آپ کہیں تجائیے ملتا نہیں سراغ ہے
دیکھیے جسکو یاں اُسے اور ہی کچھ دماغ ہے — ایک شبِ چراغ بھی گو ہرِ شب چراغ ہے
غیر سے کیا معاملہ آپ ہی ہیں اپنے دام میں — قیدِ خودی نہ ہو اگر پھر تو عجب فراغ ہے
حال مرا نہ پوچھیے جو کہوں میں سو کیا کہوں — دل ہے سو ریش ریش ہے سینہ سو داغ داغ ہے
کھو نہ سکے کبھو تمہارے نشے کی آبرو — دیدۂ آئینہ کی طرح مجھ سے بھرا ایاغ ہے
سیکھتے ہیں یوں کہ آہ کو جیسے ہے کچھ پتہ با کہیں — اپنی تلاش سے غرض ہمکو ترا سراغ ہے
غفلتِ دل سہی مگر پنبۂ گوشِ خلق درد — بلبل داستاں ترا ورنہ ہر ایک باغ ہے

مرزا محمد رفیع سودا

آرام پھر کہاں ہے جو ہو دل نہ جا کہیں — آسودہ زیرِ چرخ نہیں آشنا کسے ہیں

ممکن نہیں ہے یہ کہ بھرے کاسۂ طمع دل میں کرو ہزار جو پھر اوس گداے حرص
انسان ہو ذلیل زمانے کے ہاتھ سے ذلت کو اپنی کیجیو نہ دیوے سواے حرص
کر منہ کو چاک بسوے قناعت یہ حرف ہائے رہتی ہے لاکھ طمع کی آفت قفاے حرص
ناداں تلاش قطرۂ زر سے تو باز آ جوں شمع یوں نہ ہو کہ ترا سر کٹاے حرص
اپنے سوا کسی کو نہ پایا حریص حیف کی قطع روزگار نے ہم پر قباے حرص
سودا بسر ہو خوبی سے اوقات ہر طرح یہ درمیاں نہ ہووے بشرطیکہ پاے حرص

۲

طبیعت سے فرومایہ کے شعر تر نہیں ہوتا جو آب چاہ کا قطرہ ہے وہ گوہر نہیں ہوتا
ہنر سے دور ہے جاہل کی خلقت کا آئینہ خمیر سنگ سے بنتا ہے تو جوہر نہیں ہوتا
نجانے عکس رو اسمیں پڑا کس اہل جنت کا کتاب آئینہ سے لب کسو کا تر نہیں ہوتا
سعادتمند ہو گر جی کہ بعد از مرگ عالم میں ہما کے بال کا صرف بجز افسر نہیں ہوتا
طمع دولت کی بیتاب و تعب مت رکھ زمانے سے ہوس تا چھوٹکے آگ میں مس زر نہیں ہوتا
تلاش خضر بہر منزل مقصد نہ کر سودا کوئی خود رفتگی سے راہبر بہتر نہیں ہوتا

۳

ہے تنگ سر زمانے میں بہت عمر کا عرصہ اس میں عمل نیک کیا چاہے تو کر لے
دکھ دے نہ کسی دل کو تئیں باغ جہاں میں گر نخل حیات اپنے سے چاہے کہ ثمر لے
جوں خضر ہوس عمر ابد کی نہیں مجھکو اس دم کی تمنا ہے جو تجھ پاس گذر لے
پوچھا جو میں سودا سے کہ یاں تو کہاں کا اتنا ہی کہا بھر کے وہ دم سرد اگر لے

مومن خاں مومن

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

کیوں اُلجھتے ہو جنبش لب سے — خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب
کیوں لگے دینے خطِ آزادی — کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب
ستم آزار ظلم و جور و جفا — جو کیا سو بھلا کیا صاحب
نام عشقِ بتاں نہ لو مومنؔ — کیجیے بس خدا خدا صاحب

انشاء اللہ خاں انشا

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں — نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں — نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کسکو آہ ننگ و نام کیا شے ہے — غرض رو پیٹ کر ان سبکو ہم اکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو — جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشاؔ — غنیمت ہے کہ ہمصورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

۲

جس شخص نے کہ اپنے نخوت کے بل کو توڑا — راہِ خدا میں اس نے گویا جبل کو توڑا
اپنا دلِ شگفتہ تالاب کا کنول تھا — افسوس تو نے ظالم ایسے کنول کو توڑا
تھا ساعتِ فرنگی دل چُپ جو ہو رہا ہے — کیا جانیے کہ کس نے ہے اس کے کل کو توڑا
دارا و جم نے کیا کیا تجھ سے شکست پائی — اے چرخ تو نے کس کس اہلِ دول کو توڑا
یعنی ہے جنس دل تو خالد کو آج لے چک — پڑ جائیگا دگرنہ پھر اس کا کل کو توڑا
احوال محوِ شش اُنھوں کا انشاؔ میاں جنھوں نے — اُس ذاتِ بحت سے ہل بندِ اجل کو توڑا

۳

حق تعالیٰ کی طرف سے جسے امداد نہو / تو وہ گھر تا بہ قیامت کبھی آباد نہو
ہے یہ انصاف بھلا خوش رہے تو ہی فقط / چھٹ ترے اک متنفس کبھی دلشاد نہو
خانہ آباد۔ جو اُجڑے ہوے ہوں انکو صبا / نہ کہ یہ قصد کہ کوئی کہیں آباد نہو
مٹ گیا جبکہ حباب آہ تب آئی یہ صدا / زندگانی ہی نہیں جس کی یہ بنیاد نہو
بیستوں پر جو کھلا لالہ تو شیریں نے کہا / مجھے ڈر ہے کہ یہ خون سر فرہاد نہو
شور اتنا نہ کر اے مرغ تو اے غنچہ خموش / یاں کوئی دام لگائے کہیں صیّاد نہو
تو بھلا سوچ تو کچھ گوشۂ دل میں کیونکر / تیرے شکوے کی جگہ اے ستم ایجاد نہو
نہ جو انشا کو اجازت تو بھرے وہ نالہ / کبھی بلبل کے فرشتوں کو بھی جو یاد نہو

٤

بسکہ دنیا کی نہ رکھ اے صاحب ادراک ہوس / خاک ہی خاک ہے سب خاک کی کیا خاک ہوس
تھوڑی سی عمر میں کس شے کی ہوس کیجئے کہ بس / کرنے دیتی ہی نہیں گردش افلاک ہوس
روح مجنوں سے کوئی پوچھے کہ کیا رکھتی ہے / دشت پیمائے بیابان خطرناک ہوس
بھر گئے دامن نظارہ میں نرگس کے پھول / اور کیا رکھے ہے اب دیدۂ نمناک ہوس
میں نکالوں ہوں تصدق ہو بگولے کی طرح / کوچۂ یار میں با ہر خس و خاشاک ہوس
جب تلک شیشۂ صہبا نہوا اے زاہد خشک / یاں بجھاوے ہے کوئی کاسۂ تریاک ہوس
چل مدینے کی زیارت کو تو انشا اللہ / کہ نکالیگی تری واں شہ لولاک ہوس

٥

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو / بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو
تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو / چھوڑ دیگا وہ بھلا دیکھیے تو اور سنو
یہ بھی انصاف ہے کچھ سوچو تو اپنے دل میں / تم تو سو کہہ لو مری کچھ نہ سنو اور سنو
اب تو کچھ اتنے خفا ہو نہ کہو جو مجھ سے / ہے قسم تم کو مرا نام نہ لو اور سنو

بات میری جو نہیں سنتے اکیلے مل کے ایسی ہی ڈھب سے سناؤں کہ سنو اور سنو
شکوہ مند آپ سے انشا ہو سو اس کا کیا دخل تم نہ مانو تو کہیں چھپکے چھپو اور سنو

شیخ امام بخش ناسخ

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ازل سے دشمن طاؤس و مار آپس میں رہتے ہیں دل پر داغ کو کیونکر ہے عشق اس زلف پیچاں کا
شگفتہ مثل گل ہر فصل گل میں داغ ہوتے ہیں بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاک گلستاں کا
سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا
کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنج مرقد میں تو عالم یاد آتا ہے شب مہتاب ہجراں کا
مرا ویرانہ مثل آئینہ معمور حیرت ہے یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشم حیراں کا
جنوں میں ہجر کی شب ہاتھ دوڑاتا ہے جب اپنا کیا ہے چاک تا جیب سحر اپنے گریباں کا
تہ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ کہ عالم ہر دہان زخم پر تھا روئے خنداں کا

٢

زنہار ہو جیو نہ ذرا مبتلائے حرص ذلت کبھی دوڑی آتی ہے ناداں قفائے حرص
دنیا میں دربدر مجھے کب تک پھرائے حرص یارب قناعت آئے کہیں اور جائے حرص
دنیا کی سلطنت خاک اگر ہو عطائے حرص اتنی ہی اس کو رہتی ہے اشتہائے حرص
توڑوں جو اپنے پائے طلب فائدہ نہیں تدبیر وہ کروں کہ شکستہ ہو پائے حرص
ہے کشتی نجات قناعت ہی ناسخا ڈوبیں گے بحر غم میں جو ہیں آشنائے حرص

٣

ماہ ہے جو وہ خورشید مقابل ہوگا یہ یقیں ہے کہ نظر آتے ہی کامل ہوگا
آشیانی نہیں مکہ سوا خدا ہے جس کا طائر قبلہ نما کا سا وہ بسمل ہوگا

کلام صاف کو اپنے جو دیکھے اس کو حیرت ہو — یہ آئینہ ہوا ہے جوہر ادراک سے پیدا
ہمارے خلق میں ذرات ذکر ذات اقدس ہے — قضا نے کی ہے یہ تسبیح خاک پاک سے پیدا
غنیمت ہی سمجھئے حلقۂ احباب گرد اپنے — یہ دورہ پھر نہ ہوگا گردش افلاک سے پیدا
دماغ حضرت یعقوب عاشق اس کو کہتے ہیں — ہوئی ہے بوی یوسف یار کی پوشاک سے پیدا
دل صد پارہ کے ہر پارہ پر نقش محبت ہے — کہاں ہو سکتے ہیں ایسے نگیں حکاک سے پیدا
مسیحا سے ہمارے عیسی مریم کو کیا نسبت — شفا ہوتی ہے کسکی آستانے کی خاک سے پیدا
ہنر سے نیاریوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہمکو — مقدر میں جو دولت ہو تو زر ہو خاک سے پیدا
کنارہ کچھ ہستی سے نہیں بے جان سے گذرے — کنارہ گور ہے اس کا جو ہو پیراک سے پیدا
دعا ہے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو — یہ مشت خاک ہووے کربلا کی خاک سے پیدا

۳

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے — منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے
مقسوم کا جو ہے سو وہ پہونچیگا آپ سے — پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پساریے
طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار — زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریے
تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے — کوئی آشنا ہے حال ہے کسکو پکاریے
تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوے — بس خاک میں ملا چکے چلئے سدھاریے
تاکید رہروں کو شرط ہے آتش خیال یار — شیشہ خدا جو دے تو پری کو اتاریے

۴

زمیں پر چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا — بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن — لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے
نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا — مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
بہار گلستاں کی ہے آمد آمد — خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا توانا کئے ناتواں کیسے کیسے
دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے تمھارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے
غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

شیخ محمد ابراہیم ذوق

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا جو آپ ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

۲

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے کم نہیں ہرگز زباں منھ میں ترے مسواک سے
جب بنی تیرِ حوادث کی کمان افلاک سے خاک کا تودہ بنا انساں کی صنعتِ خاک سے
جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر جھانکتا ہے دل تجھے یوں سینۂ صد چاک سے
تیرے صیدِ نیم جاں کی جاں نکلے کس طرح یہ تو وابستہ ہے تیرے دامنِ فتراک سے
آفتابِ حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم اشکِ خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے
چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب کرتا وہ پردہ نشیں پردہ تو ہے ادراک سے
عیبِ ذاتی کو چھپائیگا نہ حسنِ عارضی زیب جا جسم کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

۳

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے ۔ اُنکا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدّر دونوں ۔ کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت ۔ تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے
کیا تماشا ہے کہ مقبل پہ نہ دیکھے فروغ ۔ خود نمائی کو ہیں چمکا رہے شہرت والے
کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا ۔ دل بیمار کے ہیں ڈھیر ہی عیادت والے
ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق ۔ اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

۴

زمیں پہ خوبیٔ قد کے کرنے سے صاف اظہارِ دشمنی ہے ۔ کہ ہیں جو رو شمشیر اُنکا فروتنی اُن کی فروتنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اُسکی فروتنی ہے ۔ وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اُسی کے جلوے کی روشنی ہے
ہوئے ہیں تر تر یہ ندامت سے اسقدر آستین و دامن ۔ کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاکدامنی ہے
ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ آشتی کے ۔ اگر نہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے
لگا نہ اس تیکھے میں گو دل یہ ہے طلسم شکست غافل ۔ کہ کیسا ہی کوئی خوش شمائل صنم ہے خو شکستنی ہے
نہیں ہے قائم کہ خواہشِ زر وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر ۔ جہاں میں ہیں ہاتھ کیمیا گر ہمیشہ محتاج دل غنی ہے
کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہ لیکن ۔ جو اسکے نزدیک رہبری ہے وہ اسکے نزدیک رہزنی ہے

بہادر شاہ ظفر

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا ۔ اس جا ہے بے زباں دہنِ قال و قیل کا
پانی میں اس نے راہبری کی کلیم کی ۔ آتش میں وہ ہوا چمن آرا خلیل کا
اس کی مدد سے فوجِ ابابیل نے کیا ۔ لشکر تباہ کعبہ پہ اصحابِ فیل کا
پیدا کیا وہ اس نے بشر عشق سے عتیق ۔ پل جس کی ساق پا سے بنا رودِ نیل کا
پھرتا ہے اس کے حکم سے گردش میں رات دن ۔ چلتا ہے یاں کسی کا نہ کوئی جرِ ثقیل کا

کیا پائے کنہِ ذات کو اس کے کوئی ظفر — واں عقل کا نہ دخل نہ ہرگز دلیل کا

٢

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے — کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے — کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
کشتۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھکو — عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن — زلفِ مشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے — قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے — تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا
شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے — ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر — ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

٣

انسان اپنے جامے سے باہر نکل کے چل — دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کم ظرف پُر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ — مانندِ جوشِ خم نہ زیادہ اُبل کے چل
فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوزِ دل کے ساتھ — اسپر سپند وار نہ اتنا اُچھل کے چل
یہ غول وش ہیں ان کو سمجھ تو نہ رہنما — سائے سے بچ کے اہلِ فریب و دغل کے چل
اوروں کے بل پہ بل نکر اتنا نہ چل نکل — بل ہے تو بل کے بل پہ تو کچھ اپنے بل کے چل
انسان کو کل کا پتلا بنایا ہے اس نے آپ — اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل
پھر آنکھیں بھی تو دیں ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم — کہتا ہے کون تجکو نہ چل چل سنبھل کے چل
جو امتحانِ طبع کرے اپنا اے ظفر — تو کہدو طور پہ تو اس غزل کے چل

٤

وہاں کی مخلصی اے واے قسمت ہو تو کیونکر ہو — کہ میں آلودۂ عصیاں ہوں جو رحمت ہو تو کیونکر ہو
بگڑ رونے کے یہاں چشمِ عنایت ہو تو کیونکر ہو — نہ بہے اشکِ ندامت جوشِ رحمت ہو تو کیونکر ہو
جہاں ہو نفس سا رہزن جہاں شیطاں ہو دشمن — وہاں طاعت ہو کیونکر اور عبادت ہو تو کیونکر ہو
غرورِ جاہ نے کھو دی وہ مغزِ جاں میں بیہوشی — کہ زائل نشۂ پندار و نخوت ہو تو کیونکر ہو
گراں باری گناہوں کی اٹھائے سر پہ ہیں تیری — الٰہی کیا کروں پھر دفعِ خجلت ہو تو کیونکر ہو
نتیجہ جب کہ ہو اعمالِ بد کا حالِ بد اپنا — تو پھر ناحق کسی کی کچھ شکایت ہو تو کیونکر ہو
ہوس کی ہے چل یاں سے کہہ ہے [illegible] — توکل ہو تو کیونکر ہو قناعت ہو تو کیونکر ہو
بہ رنگِ طائرِ تصویر ہوں میں دامِ حیرت میں — رہائی کی مری کوئی بھی صورت ہو تو کیونکر ہو
وہ ہمت ہی سے ہو سکتا ہے جو ہے کام ہمت کا — نظر ہے ہمتوں سے صرف ہمت ہو تو کیونکر ہو

منشی امیر احمد امیر مینائی

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا — کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا
باتیں بھی کیں خدا نے دکھایا جمال بھی — اللہ کیا نصیب جنابِ کلیم تھا
دنیا میں کچھ قیام نہ سمجھو کرو خیال — اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا
دنیا کا حال اہلِ عدم سے یہ مختصر — اک دو قدم کی کوچۂ امید و بیم تھا
ہم اپنی دھن میں مست تھے کیا جانیں حشر میں — کس سمت کو جناں تھا کدھر کو جحیم تھا
سامانِ عفو کیا میں کہوں مختصر یہ ہے — بندہ تھا گنہگار تھا خالق کریم تھا
کرتا میں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع — جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا
جس دن تھا میں چمن میں ہوا خواہِ گل امیر — نامِ صبا کہیں نہ نشانِ نسیم تھا

٢

بیاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی — بہ رنگِ بو ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا　　اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

ہوا فروغ جو مجھکو غمِ زمانہ ہوا　　پڑا جو داغ جگر میں چراغ خانہ ہوا

جب آئی جوش میں میرے کریم کی رحمت　　گرا جو آنکھ سے موتی دُرِ یگانہ ہوا

بچھے مہینوں ہی تنکے غریب بلبل نے　　مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہوا

اٹھائے صدمے پہ صدمے تو آبرو پائی　　امیر ٹوٹ کے دل گوہرِ یگانہ ہوا

۳

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں　　پھرتے تھے یونہی ہم بھی خوش خوش کبھی وطن میں

آوارہ کے ہم نے ایام عمر کاٹے　　دو چار دن سفر میں دو چار دن وطن میں

ظاہر پہ جا نہ اس کے ہے پیر زال دنیا　　غافل ہے یہ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

حال بدن کہوں کیا دل ہی بجھا ہوا ہے　　اک شمع ہے سو وہ بھی خاموش انجمن میں

یاروں سے اُنس کیسا غربت میں عمر گذری　　ٹھہرے مسافرانہ دو چار دن وطن میں

راتوں کو شکلِ شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے　　ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں

غربت میں ہے جو صورت خط میں لکھوں کہاں تک　　تصویر اپنی بھیجوں احباب کو وطن میں

[illegible] سفید سر پر تیاری عدم ہے　　غربت سے خاک اٹھاتے جاتے ہیں ہم وطن میں

وحشت امیر اپنی کچھ آج سے نہیں ہے　　مانندِ گل ازل سے ہے چاک پیرہن میں

۴

دیر میں کون ہے کعبہ میں گذر کر سکتا ہے　　یار کا گھر یہ اگر ہے تو وہ گذر کر سکتا ہے

تندرستوں نے قضا کی ہوئے بیمار صحیح　　پہلے کیا جانیے دنیا سے سفر کر سکتا ہے

واسطے لی خاک نشینی سے ہوئی نشو و نما　　خاکساری کا نہیں تو یہ اثر کر سکتا ہے

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے　　سخت دونوں میں خدا جانے سفر کر سکتا ہے

چھپ رہا ہے قفسِ تن میں جو ہر طائرِ دل　　آنکھ کھولے ہوئے شاہیں نظر کر سکتا ہے

کھول کر منہ کو مرے گور میں مانندِ عروس　　بولی عبرت کہ ذرا دیکھ یہ گھر کسکا ہے
نام شاعر نہ سہی شعر کا مضمون ہو خوب　　پھل سے مطلب ہمیں کیا کام شجر کسکا ہے
شوق ہوتا ہے عمارت کا تو مجھ سے عبرت　　کہتی ہے گور جھنکا کے کہ یہ گھر کسکا ہے
میری حیرت کا یہ باعث ہے شبِ وصل امیر　　سر بزانو ہوں کہ زانو پہ یہ سر کسکا ہے

نواب مرزا خاں داغ

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے　　دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
ہم نکمے ہوئے زمانے سے　　کام ایسا سکھا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے　　دلِ بے مدعا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے　　کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھکو　　بے غرض جو دیا دیا تو نے
نارِ نمرود کو کیا گلزار　　دوست کو یوں بچا دیا تو نے
صبح موجِ نسیم گلشن کو　　نفسِ جاں فزا دیا تو نے
شب تیرہ میں شمع روشن کو　　نور خورشید کا دیا تو نے
نغمہ بلبل کو رنگ و بو گل کو　　دلکش و خوشنما دیا تو نے
کبھی مشتاق سے حجاب ہوا　　کبھی پردہ اٹھا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھسے خواہش کی　　اس سے مجکو سوا دیا تو نے
رہبر خضر و ہادیِ الیاس　　مجکو وہ رہنما دیا تو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب　　نقشہ ایسا جما دیا تو نے
ہے یہی راہ منزل مقصود　　خوب رستے لگا دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا　　تو جہنم کو کیا دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تو نے

۲

یا رب ہے بخش دینا بندے کو کام تیرا — محروم رہ نہ جائے کل یہ غلام تیرا
جبتک ہے دل بغل میں ہر دم ہے یاد تیری — جبتک زباں ہے منہ میں جاری ہے نام تیرا
ہے تو ہی دینے والا پستی سے دے بلندی — اسفل مقام میرا اعلےٰ مقام تیرا
محروم کیوں رہوں میں جی بھر کے کیوں نہ دو گے — دیتا ہے رزق سب کو ہے فیضِ عام تیرا
یہ داغ بھی نہ ہوگا میرے سوا کسی کا — کونین میں ہے جو کچھ وہ ہے تمام تیرا

۳

ثبات بحرِ فنا میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا — نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ خواب دیکھا
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا — برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا
سرورِ عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے — سُنا نہ کانوں سے تھا جو ہم نے وہ آنکھوں سے انقلاب دیکھا

۴

اب دل ہے مقام بیکسی کا — یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا
جو دم ہے وہ ہے بسا غنیمت — سارا سودا ہے اپنے جی کا
آغاز کو کون پوچھتا ہے — انجام اچھا ہو آدمی کا
کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو — جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

۵

ہم دشمن بھی یکجا ہوں تو الفت ہو ہی جاتی ہے — یہ ہے مل بیٹھنا ایسا محبت ہو ہی جاتی ہے
مصیبت گر کسی پر ہو مصیبت ہی کا خوگر ہو — اگرچہ کیسا ہی مضطر ہو قناعت ہو ہی جاتی ہے
نہ سمجھو داغ کو نالاں سمجھ تو وہ بھی ہے انساں — کہ ان باتوں سے اے ناداں کدورت ہو ہی جاتی ہے

۶

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے — بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے
ملے جو بے وطنی میں ذرا بھی آسائش — عقیق جا کے عدن میں گہر یمن میں رہے
مسافرت میں جب آرام پاؤ گے اے داغ — کہ تم سفر میں رہو آسماں وطن میں رہے

۷

غم اٹھانے کے واسطے دم ہے — زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے
کہتے ہو کچھ کہو کہوں کیا خاک — جانتا ہوں مزاج برہم ہے
اک جہاں مہرباں ہوا تو کیا — مہربانی تری مقدم ہے

۸

گلشن میں ہرے ہو کے شجر لائے ثمر بھی — اے بارش رحمت کوئی چھینٹا تو ادھر بھی
اک چیز ہے اس عالم ہستی میں بشر بھی — دنیا کا طلبگار بھی دنیا سے حذر بھی
ہوتی ہے دعا کافر و دیندار کی مقبول — اللہ کی سرکار میں ملتا ہے اثر بھی

منشی امیر اللہ تسلیم

نہ ہوگا حشر میں کوئی کسی کا — بھروسا ہے تو اپنی بیکسی کا
رولاتا ہے مجھے کیوں اسقدر محبت — لیا تھا نام میں نے کب ہنسی کا
سدا گریاں رہا مانند شبنم — نہ دیکھا منہ مرے غم نے خوشی کا
نہ کچھ دنیا میں رکھتا ہوں نہ دیں میں — بھلا ہو دو جہاں میں مفلسی کا
خیال آیا تری رحمت کا جس دم — جگر پانی ہوا تر دامنی کا
تہی خالی کو بھی چھوڑا لحد میں — خیال آیا جو حسد بیکسی کا
مرا جو نالۂ موزوں ہے تسلیم — تصدق ہے نسیم دہلوی کا

کرو نہ دیر جہاں میں جہاں سے آئے چلو — یہاں گماں خطر ہے قدم بڑھائے چلو
یہاں فریب نشیب و فراز اکثر ہے — خدا کے واسطے اتنا نہ منھ اٹھائے چلو
شکستہ پا ہوں کہیں ساتھ سے نہ رہ جاؤں — مجھے بھی ہاتھ ذرا دوستوں لگائے چلو
ہمیشہ تنگ عدم کے ہے رہو سفری — ادھر سے اپنے کو پیک قضا جتائے چلو
ابھی تو حسن عمل کا زمانہ باقی ہے — وہاں کی بگڑی ہوئی کچھ یہیں بنائے چلو
ادھر ادھر کہیں بھر کر ترا نہ رہ جانا پڑے — سمند عمر رواں کو ذرا دبائے چلو
عدم میں ترسو گے دردِ جگر کو اے تسلیم — جو ہو سکے کوئی سینے پہ تیر کھائے چلو

۱۸۱

قریب کام بڑے وقت پر نہیں آتا — بجھانے دل کی لگی کو جگر نہیں آتا
کہاں گئے جو عیادت پہ جان دیتے تھے — مزار میں کوئی لینے خبر نہیں آتا
حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو — یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا
انھیں کو نشۂ دولت میں بھولے ہیں منعم — خبر نہیں کہ وہاں کام زر نہیں آتا
جہاں میں صورت تصویر ہوں سراپا خوب — مگر یہ عیب ہے کوئی ہنر نہیں آتا
وہ شمع ہوں کہ جلاتے ہیں دوست دشمن سب — کسی کو رحم مرے حال پر نہیں آتا
خیال گریہ ابھی تک ہے ابر و طوفاں کو — کہ اشک دیدۂ تر جوش پر نہیں آتا
خیال تمام ہے اپنے سے منتفع ہوتا — صدف کے کام کسی دن گہر نہیں آتا
ابھی خفا ہے فلک مثل تیر بے غمی — ورا جہاں میں کوئی نظر نہیں آتا
ابھی سے کیا کریں دعویٔ شاعری تسلیم — یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

مولوی الطاف حسین حالی

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا — اک بندۂ فرماں ہے جہاں سارا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا — بندے سے مگر ہوگا حق کیونکہ ادا تیرا
محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم — کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا
جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعت سلطانی — کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا
عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی — ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا
تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو — جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا
نشے میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بے خود — جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا
سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے — جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا
طاعت سے ادب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھ کر — عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا
آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری — گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا
ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے — کچھ رنگ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

۲

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا — باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ — ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی وگدا میں ہے طبیعی — جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی پر دل بندھے ہوئے ہیں — ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں — لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی — پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی — آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے — دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا
ہے پور زال سے دل اس کا قوی زیادہ — رکھتی ہے آسرا یاں جو پیرزال تیرا
ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی — یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگِ آشنائی — سن سن کے سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا

۳

دنیا میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجے گا — یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اسکا چرچا نہ کیجے گا

ہوا کہ غیروں کا غیر کوئی سمجھا نہ اُس کو غیر ہرگز — جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُس کو تصور اپنا نہ کیجے گا

سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعوےٰ — یہ کہہ کے دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجے گا

اسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہمکو — کرے وہ یاد اسکی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجے گا

لئے اگر دین تم کو واعظ کہ کہتے کچھ اور کرتے ہو کچھ — زمانے کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجے گا

نہال ہے شیخ باکمال نہیں ملا پہ ان میں حرف گیرو — جو ہم پہ کیجے چوٹ کیجے گا تو آپ بیجا نہ کیجے گا

لگا کے تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ الفت کی آگ زاہد — پھر اور کیا کیجے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجے گا

تمہارے نفاد و مستند ہیں حالی اور اپنے بیگانے کا رضا جو — سلوک اس سے کئے یہ تم نے تو ہمسے کیا کیا نہ کیجے گا

۴

نفس دعوئے بیگناہی کا سدا کرتا رہا — گرچہ اُترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا

حق نے احسان میں نہ کی اور میں نے کفران میں کمی — وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی — چپکے چپکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا

طاغیوں کی ضد سے زہد پیچ کر چلا راہِ خطا — وار اُن کا اس لئے اکثر خطا کرتا رہا

نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی — اُسکو جیسے دل سے گرہ گرہ کرتا رہا

تم نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہیں — اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

تھا نہ استحقاق جنسیں پہ تحسین سدا — حق ہے جو دولت ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا

شہرت اپنی جسقدر بڑھتی گئی آفاق میں — کبرِ نفس اتنا ہی یاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر — نفس پہ اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

۵

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتادیگی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے بدخشاں و ختن کس کا ہے

قوم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیت حزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلمان نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا
ورنہ بے عیب زمانے میں چلن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں رُعب اسے گُل و نسریں و سمن کس کا ہے

عشق اُدھر عقل اِدھر حسن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھیے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مرغِ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

سیّد اکبر حسین صاحب اکبر

خوشامد کرتے ہیں غیروں کی اور آپس میں لڑتے ہیں
یونہیں بربادیاں آتی ہیں یونہیں گھر بگڑتے ہیں

بزرگوں سے عداوت دوستی بےوجہ غیروں سے
ہم اس پر ترقی تہذیب کے جھگڑا کرتے ہیں

تعجب نخوتِ اہلِ زمیں پر مجھکو آتا ہے
یہ اسپر پھول کرتے ہیں کہ جسمیں کیڑے گڑتے ہیں

ہمارا جوش میں آنا دکھا ہی دیگا رنگ اپنا
ابھی اس میکدے میں ہم پڑے گوشے میں سڑتے ہیں

تحیر آپ کی غزلوں میں آتا ہے مجھے اکبر
بتوں پر آپ مرتے ہیں کہ شیطانوں سے لڑتے ہیں

۲

مذہب ہی سے حفاظتِ قومی ہے اے عزیز
ناداں ہے جو اسے اٹھادے جو چول سے

اتنا ہی آدمی میں سمجھے کمالِ فہم
جتنا کہ احتراز کرے وہ فضول سے

جو کام آئے میرے کروں اس طرف کو رُخ
تخصیص سرو سے ہے نہ وحشت ببول سے

ہرگز اُس انجمن کو نہ سمجھو مُمدِ قوم
خالی ملے جو ذکرِ خدا و رسول سے

۳

تسکینِ دل اِس بزم میں واللہ نہ پائی — چاہا تھا نکل جائیں مگر راہ نہ پائی
معنی سے ہے معرّا نظر آیا مجھے ہر نقش — آنکھوں نے کوئی صورتِ دلخواہ نہ پائی
غوّاص رہے بحرِ حقیقت کے ہمیشہ — فکرِ حکما نے بھی مگر تھاہ نہ پائی
دیکھی نہ کوئی بات سوا نام کے اس میں — کچھ لذّت شان و حشم و جاہ نہ پائی
بارِ دلِ پُر غم میں کمی ہوتی کچھ اِس سے — فریاد کی طاقت بھی مگر آہ نہ پائی
لذّت کا ادب اُٹھ گیا جس قوم کے دل سے — اقبال کی سمت اُس نے کبھی راہ نہ پائی

۴

مفتوں ہوگئے ہم اِس بے بقا چمن کے — آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی نے پھول بن کے
ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دیکھیں — اُٹھے جو ہیں بگولے برباد ہوں گے تن کے
گو بجی بہت ہے اِس میں فریاد بیکسوں کی — ٹکڑے اُڑینگے اِک دن اِس گنبدِ کہن کے
غربت میں عمر گذری نام و نشاں نہ پوچھو — نقشے بھی ذہن میں اب باقی نہیں وطن کے
تھی نیک سعی تیری اے بادِ صبحگاہی — تجکو کیا معطّر کلیوں نے پھول بن کے

۵

آئینہ رکھدے بہارِ غفلت افزا ہوچکی — دل سنوار اپنا جوانیِ خود آرا ہوچکی
خانۂ تن کی خرابی پر بھی لازم ہے نظر — زینت و آرایشِ قصرِ مُعلّیٰ ہوچکی
بیخودی کی دیکھ لذّت کرکے ترکِ آرزو — ختم ہوچکی حدِّ ہوس مشقِ تمنّا ہوچکی
حُسنِ مطلق کے تصوّر سے بھی لے دو ایک جام — رُخ سے زیبا ہوچکا زلفِ چلیپا ہوچکی
چل بسے باراتِ ہمدم اُٹھ گئے پیارے عزیز — آخرت کی اب کر اکبرؔ فکر دنیا ہوچکی

ترکیب بند

ترکیب بند۔ چند اشعار جس کا وزن و قافیہ یکساں ہو غزل کے طور پر لکھکر اُنکے

بعد ایک شعر (بیت) وزن کا ایسا لگائیں جس کا قافیہ اور ردیف جدا ہو اِن سب کا نام بند ہے اگر ایسے کئی بند جمع کریں تو اگر ہر بند کا شعر آخر (بیت) مکرر لایا جائے اُس کو ترجیع بند کہتے ہیں۔ اگر اخیر کا شعر ہر بند کا جداگانہ ہو تو اُس کو ترکیب بند کہتے ہیں۔ بند کے اشعار پانچ سے کم اور گیارہ سے زیادہ نہیں ہوتے۔

ایک پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھکو گذرا ہوا زمانہ — وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسماں کی — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا
پتّوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی میں — ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت — آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ
تڑپا رہی ہے مجھکو رہ رہ کے یاد اس کی — تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانہ

اِس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں — ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں — میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں — میں دل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں اُن کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

ارمان ہے یہ جی میں اُڑ کر چمن کو جاؤں — ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں
بیری کی شاخ پہ ہو ویسا ہی پھر بسیرا — اُس اُجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں

چکتا پھر دل چمن میں دانے ذرا ذرا سے ساقی جو ہیں پرانے اُنسے ملوں ملاوں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دُکھتے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد جس نے رہکر دن اپنے ہوں گذارے اُس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجکو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے   اقبال۔ ایم۔ اے

قطعات

قطعہ اُن مجموعہ اشعار کو کہتے ہیں جس میں فقط دوسرے مصرعوں میں قافیہ ہو۔ غزل یا قصیدہ سے اگر مطلع نکال ڈالیں تو قطعہ رہجائیگا۔ اور قطعہ کے اشعار دو سے کم نہیں ہوتے۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

میر محمد تقی میر

کل پانوں ایک کاسۂ سر پر جو پڑ گیا یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بیخبر میں بھی کبھو کسی کا سر پُر غرور تھا

میر

یاں بُلبل اور گُل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول گلگشت سرسری نہیں اس گلستاں کا
گُل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر مرغ چمن نشاں ہے کسی خوش زباں کا

آشفتہ

وہی عالم اچھا تھا آشفتہ جس میں وجود و عدم کا نہ رنج و محن تھا

نہ ہستی کا نام و نشاں تھا ذرا کچھ — وہ ہم تھے نہ دل تھا نہ ہم جان و تن تھا
نہ خوفِ قیامت نہ تشویشِ دنیا — نہ فکر اور نہ سودائے گور و کفن تھا
نہ سر تھا نہ شور جنوں کی یہ شورش — نہ دل تھا نہ اسکا یہ دیوانہ پن تھا
کھلی آنکھ خوابِ عدم سے تو دیکھا — اجل سر پہ اور گرد برد گور کفن تھا

نظیر اکبر آبادی

عجب سیر دیکھی نظیر اس چمن کی — ابھی وصل تھا نرگس و نسترن کا
ابھی یک دگر جمع تھے سنبل و گل — ابھی تھا بہم جوش سرو سمن کا
ابھی چہچہے بلبلوں کے عیاں تھے — ابھی شور تھا قمریٔ نغمہ زن کا
گھڑی بھر کے پھر بعد دیکھا یہ عالم — کہ نام و نشاں بھی نہ تھا اس چمن کا

ناسخ

گذر ناگہاں جو ہوا شہرِ خموشاں میں — عجب نقشہ نظر آیا وہاں شاہانِ عالم کا
کہیں آئینہ زانوئے سکندر کا شکستہ تھا — کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاک میں جم کا

سوز

قبروں میں دیکھتے ہیں [illegible] انہی آنکھوں سے رحم — یہ برادر یہ پدر یہ خویش یہ فرزند ہیں
لو یہی ٹھوکر مار کر چلتے ہیں جن نالوں سے یار — سوجھتا اتنا نہیں ہم خاک کے پیوند ہیں

سودا

اے نسیمِ سحری مہر و مروت سے ہے دور — ہے نہایت نظر آیا یہ گلستاں مجھکو
ایک گل بھی سرِ طرح نہ ہوا چلتے وقت — خار نے بھی نہ رکھا کھینچ کے داماں مجھکو

ظفر

عاشقو ہو کہ نہو تم تو سفر میں کچھ سود — ساعتِ نیک سے منجم سے مگر پوچھتے ہو
نیک جب جاتے ہو دنیا سے سوئے ملکِ عدم — نہ کوئی دن نہ گھڑی وقتِ سفر پوچھتے ہو

عاشق تھا ایک کافر بے پیر کا یہ شخص — اب تک اُسی کا اس کے تئیں انتظار ہے
سودا مجھے یقین ہوا تب سنی کہ آہ — عاشق کو بعد مرگ کے بھی انتظار ہے

مثنویات

مثنوی۔ لغت میں مثنوی کے معنی ہیں دو دو کیا گیا۔ اصطلاح میں اُس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ اور اُس کے تمام اشعار مسلسل ہوں۔

حمدِ باری تعالیٰ

اللہ کی حمد ہے زباں پر — ہے کج دماغ آسماں پر
وصف اُس کے لکھیں جو لکھنے والے — کونین کے دو ورق ہوں کالے
دی منہ کو زباں زباں کو تقریر — پتلی کو نظر نظر کو تسخیر
گردوں کو قمر قمر کو ہالہ — پہلو کو جگر جگر کو نالہ
کھانے کو دہن دہن کو کھانا — دانے کو شجر شجر کو دانا
پانی کو بھنور بھنور کو چکر — دریا کو صدف صدف کو گوہر
شب کو روز اور روز کو شب — لب کو دیے حرف حرف کو لب
آندھی کو دواں کیا دواں ہے — پانی کو رواں کیا رواں ہے
پھول اُس نے کھلائے کھلتے ہیں روز — دو وقت ملائے ملتے ہیں روز
ہر اُس کا مقام بسکہ بالا — بے دم ہوتا ہے جاننے والا
خامہ یہ تھکا کہ رک گیا ہے — سر رکھتے ہی رکھتے جھک گیا ہے

(ترانۂ شوق)

مناجات

خدایا دے تو اپنے عشق کا درد — عنایت کر دلِ گرم و دمِ سرد

محبت کا دے اپنی داغ دل پر — بغیر از شمع ہے تاریک یہ گھر
خم دل میں شراب درد بھر دے — پیالے چشم کے لبریز کر دے
تعشق میں کر اپنے اس قدر غرق — نہ مجھ سے کفر و دیں میں ہو سکے فرق
عطا میرے تئیں کر یا الٰہی — جنوں کی مملکت کی بادشاہی
کہ ملک عقل کو میں دیکھے برباد — کروں جا کوہ اور صحرا کو آباد
رہے روشن مری یوں شمع ہستی — کروں ہر تن جوں پروانہ مستی
مجھے کر عشق کے خنجر سے وہ ساز — تڑپنے کی حلاوت سے نہ رکھ باز
زباں سے وہ سخن کر دے سرانجام — رہے محشر تلک جس سے مرا نام
بسان شمع یہ دل آب کر دے — گداز تن سے لذت یاب کر دے
چمن میں عشق کے یارب ہمیشہ — یہی میرا رہے تا زیست پیشہ
کرے یوں بلبل دل نالۂ زار — کہ جوں طوطی ہوں خوں آلود منقار
مجھے آتش کی دے یہ طاقت و تاب — کہ ہو جائے سمندر رشک سے آب
تمنا ہے یہ ہر اک چشم رو دے — کہ سنگ آبشار اب سینہ ہو دے
رواں رکھ تو مرے خامہ کو ویسا — لکھوں تا حمد میں بعد از مناجات
تری حمد اے چمن آرا کہاں ہو — اگر جوں سوسن تن ہمہ زباں ہو
ثنا سننے کو تیری گل ہوا گوش — دہن میں سو زباں غنچہ کی خاموش
جہاں اس باغ میں آب رواں ہو — تو موج اس کی تری رطب اللساں ہو
ثمر جب سے دیا تیں شاخ کے ہات — زباں ہے شکر کی خاطر ہر اک بات
چمن کو دیکھ مرغان خوش آہنگ — کریں ہیں وصف تیرا سب بہ یک رنگ
بھنور تک دیکھ تجھ صنعتگری کو — نظر کر شعری اور جعفری کو
سدا پھر پھر کے ہر اک پھول کے گرد — کیا کرتا ہے تیرے نام کا درد

ترے بار کرم سے شاخ ہے خم ۔ بھرے ہے بلبل بستان ترا دم
چراغ شام کو ہر شب تری لَو ۔ نسیم صبح کو تیری تک و دَو
نہ تنہا خلق کی نسرین و سنبل ۔ بنائی خلقت انسان ہر از گل
عطا کی جیسے مشت خاک کو جاں ۔ فراواں ہے دم آب و لب ناں
رکھے ہے کام میں جبتک زباں تر ۔ نمک گا ہے چکھاوے گاہ شکر
برائے پوشش تن بھی بہرحال ۔ کبھی کمبل اڑھاتا ہے کبھی شال
ہمارے واسطے اے رب معبود ۔ کرم ماں باپ سے تیرا ہے افزود
ترے احسان بیاں کیا مجھ سے ہوویں ۔ رہے بیدار تو بندے جو سوویں
رکھے ہے گرم جب ہو موسم برد ۔ پڑے گرمی تو دے ہے گوشۂ سرد
رکھے ہے تجھ سے شیخ و برہمن راہ ۔ تری کیا ذات ہے اللہ اللہ
سخن سننے کو تو نے بخشے ہیں گوش ۔ سمجھنے کو دیا ہے فہم اور ہوش
زباں کی خلق تو نے بہر گفتار ۔ کریں تا درد دل آپس میں اظہار
بیاں کیا کیجئے تیری عنایت ۔ دئے ہیں چشم اور نور بصارت
کرے تا معلوم ہو شام و سحرگاہ ۔ چلیں پستی بلندی دیکھکر راہ
زباں کو ذائقہ سے دے ہے تسکین ۔ کیا معلوم تو نے ترش و شیریں

(سودا)

مثنوی ذوق

چاہئے نام اسی کا اے خامہ ۔ زینت نامہ زیب سر نامہ
ہے فلک اک نمونہ قدرت کا ۔ یا قلمداں ہزار صنعت کا
رخ قرطاس کو صفائی دی ۔ اور سیاہی کو روشنائی دی
دیا قمری کو مصرع نالہ ۔ مصرع قد سرو پر بالا

ساقیا جلد اُٹھ و درنگ نہ کر — عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر

طاق سے تو اُتار لے شیشہ — طاق پر رکھ کتاب اندیشہ

شیشۂ مے کی یہ دراز زباں — اور پھر یہ ستم کہ پنبہ دہاں

مَیں ہوں مانندِ ساغرِ لبریز — جاں بلب جاں بلب کو کیا پرہیز

جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے — پانوں توبہ کے لڑکھڑانے لگے

کردے یاں تک مجھے نشہ میں چُور — تاکہ مانندِ خوشۂ انگور

دل کے سارے پھپھولے توڑوں میں — نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی — نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

بسترِ رنج و کنجِ تنہائی — رات کیا آئی اک بلا آئی

شام سے حال ہے یہ صبح تلک — نہیں لگتی مری پلک سے پلک

کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور — کیا شفق نے کھلا دیا سیندور

جانِ بیتاب جیسے ہے کل برق — وہ بھی گرمِ رہِ فنا کا برق

نبضیں چھوٹی ہوئی غشی طاری — ایک فرقت ہزار بیماری

دل سے رخصت ہے تاب طاقت کی — بیقراری نے استقامت کی

ہوسِ سیرِ باغ ہے کس کو — دل ہے کسکو دماغ ہے کسکو

کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر — سگِ دیوانہ بن گیا ہے گھر

مثنوی دریائے عشق میر تقی میر

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — اس کی ہر اک جگہ نئی ہے چال

دل میں جاکر کہیں یہ درد ہوا — کہیں سینہ میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہوکے بہا — کہیں سر میں جنون ہوکے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

گہ نمک اس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا

واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ — یاں تبسم ہے زخمِ تر کے بیچ

کہیں افسوس کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے

تھا کسو دل میں نالۂ جانکاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ

تھا کسو کی پلک تمنا کی — ہے کسو خاطروں کی غمناکی

کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں اندوہِ جانِ آگہ تھا — سوزشِ سینہ ایک جاگہ تھا

کہیں عشاق کا نیاز ہوا — کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا

ہے کہیں دل جگر کی بیتابی — تھا کسو مضطرب کی بے خوابی

کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا — کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا

طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا — بے ستوں میں شرارِ تیشہ رہا

کہیں گلزار میں لگائی آگ — کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ

کبھو افغانِ مرغِ گلشن تھا — کبھی قمری کا طوقِ گردن تھا

کسی مسلخ میں جا قتادہ ہوا — کہیں دل ہو کے پارہ پارہ ہوا

ایک عالم میں دردمندی کی — ایک عالم میں جاں سپندی کی

ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود — ایک لب پہ سخن ہے خوں آلود

اک زمانے میں دل کی خواہش تھا — ایک تن میں جگر کی کاہش تھا

کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

نثارِ خمارِ دلِ غریباں ہے — انتظارِ بلا نصیباں ہے

کبھی شیون ہے اہلِ ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جانِ پُرغم کا

آرزو تھا امیدواروں کی　　درد مندی جگر فگاروں کی
ڈھنگ زخم سینہ ریشاں ہے　　نگہ یار مہر کیشاں ہے
حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں　　شوق کی اب نگاہ تھا یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبا　　ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محروم وصل یاں سے گیا　　کر نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکا ہے　　ہاں یہ نیرنگ ساز پکا ہے
جس کو ہو اس کی التفات نصیب　　ہے وہ مہمان چند روز غریب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے　　کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

حُبِّ وطن

اے سپہر بریں کے سیارو　　اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا　　اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری　　اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھونکو　　دہر ناپائدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز　　تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا　　تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے ساماں تھے　　تم مرے درد دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی　　تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن ایک اک تمھاری بھاتی تھی　　جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری　　دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے　　ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے

بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب ۔ دھو کے اٹھتے تھے دل کے داغ شتاب

کوہ و صحرا و آسمان و زمیں ۔ سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں

پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار ۔ جی ہوا تم سے خود بخود بیزار

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے ۔ نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے

سیر گلشن ہے جی کا اک جنجال ۔ شب مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ و صحرا سے تا لب دریا ۔ جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں ۔ تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور ۔ یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا ۔ پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن اے مرے بہشت بریں ۔ کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا ۔ وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے مورد آلام ۔ تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے ۔ گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا ۔ تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال ۔ تجھ بن ایک ایک پل ہے ایک اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے ۔ یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جاں نثار ۔ یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں ۔ اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو ۔ مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کو نمو تجھ سے ۔ روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما ۔ سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا
حملہ جب قوم آریہ نے کیا — اور بجا اُن کا ہند میں ڈنکا
مُلک والے بہت سے کام آئے — جو بچے وہ غلام کہلائے
شُودر کہلائے راکشس کہلائے — رنج پردیس کے مگر نہ اُٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبّا — نہ چھٹا اُنسے دیس پر نہ چھٹا
قدر اے دل وطن میں رہنے کی — پوچھیے پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا رام چندر کو بن باس — اور نکلا وطن سے ہوکے اُداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر — پر چلا ساتھ لے کے داغِ جگر
پاؤں اُٹھتا تھا اُس کا بن کی طرف — اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گذرے غربت میں اس قدر مہ و سال — پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا — دلمیں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آکے لگتا تھا — آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا
کٹنے چودہ برس ہوے تھے محال — گویا ایک ایک جگ تھا ایک اک سال
ہوئے یثرب کی سمت جب راہی — سیدِ ابطحی کے ہمراہی
رشتے الفت کے سارے توڑ چلے — اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہوکے خفا — پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے ساماں — پر نہ بھولے وطن کے ریگستاں
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے — سنگریزے زمین بطحا کے
گھر جفاؤں سے جنکی چھوٹا تھا — دل سے رشتہ نہ انکا ٹوٹا تھا
ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور — اور ہوا ملکِ مصر پر مامور

مصر میں چار سو تھا حکمراں — آنکھ تھی جانب وطن نگراں
یاد کنعاں جب اُس کو آتی تھی — سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دُکھ اُٹھائے تھے جس وطن میں سخت — تاج بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت بیمہری — لَو تھی اُن بھائیوں کی دلکو لگی
ہم بھی حب وطن میں گو ہیں غرق — ہم میں اور اُن میں ہے مگر یہ فرق
ہم ہیں نام وطن کے دیوانے — وہ تھے اہل وطن کے پروانے
جس نے یوسف کی داستاں ہے سُنی — جانتا ہوگا روئداد اُس کی
مصر میں قحط جب پڑا آکر — اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر
کردیا آن پہ وقت بیت المال — لب تک آنے دیا نہ حرف سوال
کھتّیاں اور کوٹھے کھولدیے — غلّت سارے ذخیرے تُل دے
قافلے خالی ہاتھ آتے تھے — اور بھر بوریاں سے جاتے تھے
یوں گئے قحط کے وہ سال گذر — جیسے بچّوں کی بھوک وقت سحر
اے دل اے بندۂ وطن ہشیار — خواب غفلت سے ہو ذرا بیدار
او شراب خودی کے متوالے — گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے
نام ہے کیا اسی کا حبّ وطن — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچّوں کا دھیان آتا ہے — کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی — لَو کبھی اہل شہر کی ہے لگی
نقش ہے دل پہ کوچہ و بازار — پھرتے آنکھوں میں ہیں درودیوار
کیا وطن کی یہی محبّت ہے — یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند — اس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں — سوکھ جاتے ہیں رُوکھ فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا　　کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آ کے کابل سے یاں بہی و انار　　ہو نہیں سکتے بارور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے　　ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دور　　اس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں　　جان کے لالے انکے پڑتے ہیں

گائے یا بھینس اونٹ یا بکری　　اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہئے حب وطن اسی کو اگر　　ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد　　نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد

جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح　　جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے　　قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

سمجھے ان کی خوشی کو راحت جاں　　واں جو نوروز ہو تو عید ہو یاں

رنج کو ان کے سمجھے مایۂ غم　　واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم

بھول جائے سب اپنی قدر جلیل　　دیکھکر بھائیوں کو خوار و ذلیل

جب پڑے ان پہ گردش افلاک　　اپنی آسائشوں پہ ڈالدے خاک

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہموطنو　　اٹھو اہل وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ　　دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک　　کرو دامن سے تا گریباں چاک

کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ　　ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار　　زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا — اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو — واں میسّر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی — جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پنھاؤ — کہ ہے اُترن تمھاری جنکا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر — ہے کوئی اُن میں خشک اور کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند — کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
مقبلو مُدبروں کو یاد کرو — خوش دلو غمزدوں کو شاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر — لو جو لیجائے کور و کر کی خبر
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو — لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو
تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ — رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ
تم اگر چاہتے ہو مُلک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی — جَین مت ہووے یا کہ بیشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
مُلک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہوگیا بدخواہ — لگی غیروں کی تم پہ پڑنے نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آئی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے — مُلک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی درّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتلِ عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام — کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام
ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم — پڑتی جو سر پہ وہ اٹھاتے تم
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے — چین کس کو ملا ہے غیروں سے
قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ — سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ
اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا — کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
شہر میں قحط کی دہائی ہے — جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے
بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا — موت کی مانگتا ہے کوئی دعا
بچّے اِک گھر میں بلبلاتے ہیں — رو کے ماں باپ کو رلاتے ہیں
کوئی پھرتا ہے مانگتا در در — ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر
پر جو ہیں اُن میں صاحبِ مقدور — اُن میں گنتی کے ہونگے ایسے غیور
کہ جنھیں بھائیوں کا غم ہوگا — اپنی راحت کا دھیان کم ہوگا
جتنے دیکھوگے پاؤگے بے درد — دل کے نامرد اور نام کے مرد
عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات — عید ہے دن تو شب برات ہے رات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے — کام انھیں اپنے حلوے مانڈے سے
اُن کو اب تک خبر نہیں اصلا — شہر میں بھاؤ کیا ہے غلّہ کا
غلّہ ارزاں ہے ان دنوں کہ گراں — کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں
کال کیا شے ہے کس کو کہتے ہیں بھوک — بھوک میں کیونکر مرتے ہیں مفلوک
سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے — اُس کے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

اہلِ دولت کا سُن چکے تم حال | اَب سُنو روئدادِ اہلِ کمال
فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد | پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
ہے طبیبوں میں نوک جھونک سدا | ایک سے ایک کا ہے تھوک جُدا
رہتے یوں اہلِ علم ہیں اِس طرح | پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح
جیندو والوں کا ہے اگر پٹھا | شیخو والوں میں جا نہیں سکتا
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار | خوشنویسوں کو ہے یہی آزار
لاکھ نیکوں کا کیوں نہو اِک نیک | دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک
اِس پہ طُرّہ یہ ہے کہ اہلِ ہنر | دُور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر
مل اِک گانٹھ جس کو ہلدی کی | اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری
نسخہ اِک طب کا جس کو آتا ہے | سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
جس کو آتا ہے پھونکنا کُشتہ | ہے ہماری طرف سے وہ گونگا
جس کو ہے کچھ رمل میں معلومات | وہ نہیں کرتا سیدھے مُنہ سے بات
باپ بھائی ہو یا کہ ہو بیٹا | بھید پاتا نہیں منجّم کا
کالشم کندے کا جس کو ہے معلوم | ہے زمانہ میں اُسکے بخل کی دھوم
الغرض جس کے پاس ہے کچھ چیز | جان سے بھی سوا ہے اُسکو عزیز
قوم پر اِن کا کچھ نہیں احسان | اُن کا ہونا نہونا ہے یکساں
سب کمالات اور ہنر اُن کے | قبر میں اُن کے ساتھ جائینگے
قوم کیا کہہ کے اُن کو روئیگی | نام پر کیونکر جان کھوئیگی
تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے | خواہ بی اے ہوں یا ایم اے
بھرتے حُبِّ وطن کا گو دم ہیں | پر محبِّ وطن بہت کم ہیں
قوم کو اُن سے جو اُمیدیں تھیں | اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں

ہسٹری اور اُن کی جو گرفی — سات پردوں میں منہ دے ہے پڑی
بند اس قفل میں ہے علم انکا — جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا
لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے — گویا گونگے کا گڑ ہیں کھائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں سیر گل تنہا — کوئی پاس ان کے جا نہیں سکتا
اہل انصاف شرم کی جا ہے — گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے
تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ — تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ
یہ جو دولت تمہارے پاس ہے آج — ہم وطن اس کے ہیں بہت محتاج
منہ کو ایک اک تمہارے ہے تکتا — کہ نکلتا ہے منہ سے آپ کے کیا
آپ شائستہ ہیں تو اپنے لئے — کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیجئے!
منہ کرسی اگر لگاتے ہیں آپ — قوم سے پوچھئے تو پُن ہے نہ پاپ
منڈا جوتا گر آپ کو ہے پسند — قوم کو اس سے فائدہ نہ گزند
قوم پر کرتے ہو اگر احسان — تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش نہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو — سینے میں جو ہے سب اگل ڈالو
علم کو اردو کو کرو ارزاں — ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
سنتے ہو سامعین با تمکیں — سنتے ہو حاضرین صدر نشیں
جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد — بندۂ قوم ان کے ہیں زن و مرد
باپ کی ہے دعا یہ بھر بھر — قوم کی کیں بنائیں اس کو سپر
ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد — قوم پر سے نثار ہو اولاد
بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں — تو اگر مال دے تو میں دوں جان
اہل ہمت کما کے لاتے ہیں — ہموطن فائدے اٹھاتے ہیں
کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری — دخل اور خرچ جن کے ہیں بھاری

اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم ‏ ‏ بحث حکمت و ادب قائم

نت نئے کھلتے ہیں دوا خانے ‏ ‏ بنتے ہیں سیکڑوں شفا خانے

ملک میں جو مرض ہیں عالمگیر ‏ ‏ قوم پر اُن کی فرض ہے تدبیر

ہیں سدا اس اُدھیڑ بُن میں طبیب ‏ ‏ کہ کوئی نسخہ ہاتھ آئے عجیب

قوم کو پہونچے منفعت جس سے ‏ ‏ ملک میں پھیلے فائدے جس کے

رسم بد کا جہاں اثر پایا ‏ ‏ گلے پہ حملہ اُسپر ہونے لگا

کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر ‏ ‏ کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر

ایک ناٹک بنا کے لاتا ہے ‏ ‏ دوسرا اُس کو کر دکھاتا ہے

لاکھ تدبیریں جی سے جوڑتے ہیں ‏ ‏ آخر اس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں

قوم کی خاطر اُن کے ہیں سب کام ‏ ‏ خواہ اِس میں سفر ہو خواہ مقام

سیکڑوں گلرخ اور مہ پارے ‏ ‏ لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے

جان اپنی لئے ہتیلی پر ‏ ‏ کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر

شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے ‏ ‏ پر کوئی بات کام کی ہاتھ لگے

جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل ‏ ‏ ملک کا آئے کوئی کام نکل

کھپ گئے کتنے نیک جھاڑوں میں ‏ ‏ مرگئے سیکڑوں پہاڑوں میں

لکھے جب تک جیے سفر نامے ‏ ‏ چل دئے ہاتھ میں قلم تھامے

گو سفر میں اُٹھائے رنج کمال ‏ ‏ کردیا پر وطن کو اپنے نہال

ہیں اب اُن کے گواہ حبّ وطن ‏ ‏ در و دیوار پیرس و لندن

کہئے دنیا کا جس کو باغ جناں ‏ ‏ ہے فرانس آج یا ہے انگلستاں

کام ہیں سب بشر کے ہم وطنو ‏ ‏ تم سے بھی ہوسکیں جو مرد بنو

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ ‏ ‏ بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں — رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں
قافلوں سے اگر ملا چاہو — ملک اور قوم کا بھلا چاہو
گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے
اُن کی عزت تمہاری عزت ہے — اُن کی ذلت تمہاری ذلت ہے
قوم کا مبتذل ہے جو انسان — بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز — ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز
عزتِ قوم چاہتے ہو اگر — جا کے پھیلاؤ اُن میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور — اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
اب نہ سید کا افتخار صحیح — نہ برہمن کو شودر پر ترجیح
ہوئی ترکی تمام خانوں کی — کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا — بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات — یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا — پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

موسمِ زمستاں

آ زمستاں کہ ہے تو بادشہِ برفستاں — شاہِ برفستان و شاہنشہِ برفستاں
تختِ اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا — اوج ہے دربار سرِ کوہ ہمالہ تیرا
مشرق تا غرب تمام ملک ہے زیرِ علمِ سفید — اُڑ رہا ہے پرچمِ اقبال ہے جوں برف سفید
جب کہ عالم پہ ہے تو [illegible] — کوہ و صحرا کو برابر ہے اُٹھا آتا
بادِ صرصر ہے [illegible] تیرا آزار [illegible] — فوجِ اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی
طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیرِ جہاں — تیرے آنے کی بجاتی ہے [illegible]

جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھوکا جاتا — مارے ہیبت کے ہے دل غنچوں میں تھرا جاتا
ہے نباتات کا عالم تہ و بالا تجھ سے — پرزے پرزے ہے گلستاں کا رسالہ تجھ سے
باغ پر جب ہے ترے قہر کا جھوکا آتا — ڈر کے ہر برگ ہے پیوند زمیں ہو جاتا
تیرے سناٹے سے ہوتی ہے ہوا جان نبات — خوف کے مارے دہل جاتے ہیں طفلان نبات
تھرتھراتے ہیں کھڑے سارے جوانان چمن — منہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحان چمن
ہیں شجر سر بہ کھڑے خاک اڑاتے سارے — گل و گلزار ہیں ویران نظر آتے سارے
نغمہ سنجان چمن پر ہیں پھلائے بیٹھے — اور پر و بال میں ہیں منہ کو چھپائے بیٹھے
باغباں کا جو گلستاں میں گزر ہوتا ہے — سب حسرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے
ہائے تھی وہ جوانان چمن ہو گئے کیا — باغ سنسان ہے مرغان چمن ہو گئے کیا
ہائے غم کس سے کہے باغ میں بلبل بھی نہیں — کان میں پوچھئے اب کس سے کہ ہاں گل بھی نہیں
نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو منہ کھولے — نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے
کہ درختان چمن باغ میں عریاں کیوں ہیں — ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیراں کیوں ہیں
اے زمستاں جو ہوئی غارے ہے ہوا بھی — فی الحقیقت ہوئی خدمت میں ترے بے ادبی
تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی — مثل زہر حشراتی کی ہے آفت ہوتی
خلق سے دفع وباؤں کی ہوا ہوتی ہے — اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے
خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے — پاتا ہے میوۂ شیریں میں حلاوت تجھ سے
تو نے ہے صاف جہاں قاف سے تا قاف کیا — شیشۂ گنبد فیروزہ ہے شفاف کیا
شال و قاقم و سنجاب پنہائے تو نے — بہت بیمار تر و خشک بھلائے تو نے
تو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا — تھا نہ کھانے کا مزا اور نہ پینے کا مزا
اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں — گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں
ہاں تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا — اور بغل سے دل وحشت زدہ نکلا جاتا

ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے بیٹھے
آگ ہاتھ آئی تو ہیں دل میں چھپائے بیٹھے

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں
بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا
پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا

اندھا بیٹھا کوئی سردی سے لحاف لپٹا ہے
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا سہے

کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں پڑے
لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے

کئی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں
ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں

کہیں شوشو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹی ہے
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے

حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے
رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑے تن کے

اسکے ہر بل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبھل بیٹھے
پردہ رنگ میں ہیں ڈبکے ہوئے گل بیٹھے

خلق سے گرمی و سردی کے جو ہے لاگ لگی
تن تو ٹھنڈے ہیں پڑے سینوں میں ہے آگ لگی

ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں
دل میں ہے آگ لگی منہ سے نکلتے ہیں دھوئیں

تیرے افضال سخاوت تہ افلاک ہیں عام
ملتی سب اہل جہاں کے لئے پوشاک ہے عام

اہل دولت کو ہیں خلعت میں دوشالے ہوتے
غربا سارے ہیں کمل کے حوالے ہوتے

کر دیا تو نے ہے خلقت کو ہر اک حال میں مست
ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست

خانِ عالم ہیں الگ بسترِ مخمل میں پڑے
فقرا بیٹھے ہیں سب ایک ہی کمل میں پڑے

اے زمستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف
تیری شبہاے دراز اور وہ ہر بات کا لطف

کی تری رات نے داناؤں کی ہے بات ٹھیک
کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی

ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا
اور جو بڈھا ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزا

بزمِ احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے
سازِ عشرت کے لئے چنگ و نوا ہے تجھ سے

صوفی و رند کے جلسے کا تو ہی ساقی ہے
بادۂ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے

ہر طرف ہے جو پیالی پہ پیالی اوڑتی
مے نہیں ہے یہ ہے تصویر خیالی اوڑتی

نے پیئے مست پڑے شکر خدا کرتے ہیں چاہتیں پی پی کے ترے سر کو دعا کرتے ہیں
شب سرما میں اگر لطف ہے بیہوشی کا تو اسی شب ہے مزا مجلس خاموشی کا
ہیں کبھی عالم ارواح کے مہماں آتے بزم دربار میں ہیں صاحب فرماں آتے
دل کے ایواں میں ہیں آکے عدالت کرتے ہیں کتابوں کے دلیل ان کی وکالت کرتے
ہوتی اتنے میں ہے افلاک پہ تنویر سحر ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیر سحر
سر پہ وہ اپنے بکھیرے ہوئے ہے موئے سفید ریش پر نور میں ہے جلوہ نما روئے سفید
شجر طور کا عالم ہے بناتا آتا ساجھ ہے کوہ ہمالہ کو اٹھاتا لاتا
ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے تک تاتار کی تصویر بنا دیتا ہے
گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانیں ہیں اور اے زمستاں ترے ملک میں آئیں ہیں اور
ایک جھوکا جو ترے حکم کا آ جاتا ہے تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے
زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک کوہ سے کاہ تلک باغ سے اشجار تلک
ہاں اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت
عقل حیراں ہے کہ سونا یہ بکھیرا کس نے آب زر روئے نباتات پہ پھیرا کس نے
بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا پتے پتے کو جلاتا ہوا اک تخت آتا
دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے
ہر شجر پہ ہے غرض رنگ بدل کر آتا کہیں زرکار ہے آتا کہیں سنگر آتا
تیرے ہر حکم کے جھونکے میں ہوا تیزی ہے کہ نباتات پہ طوفان بلا ریزی ہے
برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سر خاک پڑے اور شجر سب ہیں برہنہ تہ افلاک کھڑے
دفعتہً پیر سحر سانس ہے بھرتا ایسا یا زمانے پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا
کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے اک بار سفید دشت و کہسار سے تا در و دیوار سفید
ابر کی طرح بخارات کا گھر کر آتا برف کے پردے میں وہ روئی دھنکتے جاتا

کی سرِ خاک جو تھی برف نے سیمیں کاری   خونِ بے جرم سے کرتا ہے اُسے گلناری

صیدِ نومید کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے   تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے

ہے گذر جب کہ ترا جانبِ دریا ہوتا   آں طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا

ایسا تو حکمتِ جادو سے جماتا ہے اسے   سر بسر تختۂ الماس بناتا ہے اسے

کاروانوں کی برابر ہیں قطاریں جاتیں   جسطرح دشت میں ہر نوکی ہیں ڈاریں جاتیں

پل میں ہے کشتی و پل پار اترے جاتے ہیں   سفری سیکڑوں بے لاگ گذر جاتے ہیں

رودِ دریا پہ گذر مثلِ نظر ہوتا ہے   ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

گلشنِ دانش و فرہنگ جو ہے ملکِ فرنگ   اے زمستاں ہے زباں تیرے سبھاؤ کا رنگ

بارہ سنگے کہیں بگّی ہیں اڑاتے جاتے   جادۂ تختہ ہوا دار دکھاتے جاتے

زبس جوشِ دل و حوصلہ انگیزی میں   سب کمربستہ ہیں میدانِ سبک تیزی میں

پالوں میں کاٹھ کے موزوں کو چڑھاتے ہیں کھڑے   اور عصا اپنے سرِ برف جماتے ہیں کھڑے

قدم آگے کو رپٹ کر ہیں نکلتے جاتے   یہ اچھل جاتے ہیں اور آگے پھسلتے جاتے

کوئی گھوڑ دوڑ میں جیتا کوئی ہارا ہوگا   پر رپٹ دوڑ کا میدان تو نہ مارا ہوگا

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی   [illegible] نہیں ہاتھ میں طاقت باقی

دیکھ کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھرّاتا ہے   اور قلم ہاتھ سے تھرّا کے گرا جاتا ہے

مارے سردی کے ہے سر پاؤں کو ٹکرائے لیتا   [illegible] کی رضائی میں چھپائے لیتا

[illegible] اللہ تو ہر آن ہے بچانے والا   [illegible] آگ [illegible] بڑا ہے پالا

آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہے دل میں   اب [illegible] باقی تو یہی ہے دل میں

جوششِ عشق سے مل ہو وے جا گرمِ سخا   گرمیٔ شعر و سخن سینہ رکھے گرم سدا

[illegible]

مسدّسات

مسدّس میں چار مصرعے ہم قافیہ [illegible] کے بعد ایک [illegible] جو مصرعے کا ایک بند ہوتا

اس طرح کے مسلسل کئی بند ہوں۔ مگر مطلع غیر مقرر ہو۔ اس ایک بند کو مسدس کہتے ہیں۔

صبح کا سماں

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزہ و صحرا کی وہ لہک شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ لہک ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ چمک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربان صنعت قلم آفریدگار تھی ہر ورق پہ صنعت ترصیع آشکار
عاجز ہے فکرت شعرائے ہنر شعار ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار
عالم تھا محو قدرت رب عباد پر
مینا کیا تھا وادی مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالہ مرغان خوش نوا سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے ۔

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم کوکو کا شور نالۂ حق سرہ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربّ عُلا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ پڑھتی تھی بار بار اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں (انیس)

صبح کا سماں

پھاڑا جو گریبانِ شبِ آفت کی سحر نے پردے میں چھپایا رخِ روشن کو قمر نے
پھیلادی شعاعیں لگا نور سے بکھر نے گردوں سے سفر خوب کو اکب لگی کرنے
تاباں جو رخِ نیّرِ افلاک ہوا تھا
ذرّوں سے زرافشاں ورقِ خاک ہوا تھا

اظہار ہوئی خطِّ شعاعی کی جو تحریر دھوئے شبِ یلدا سے سیاہی ہوئی تغییر
خورشید نے کی سورۂ والشمس کی تفسیر والفجر کی کرتا تھا تلاوت فلکِ پیر
پھیلا ہوا تھا نور سحر ارض و سما میں
مصروف تھی سب خلق خدا یادِ خدا میں

خورشید کا وہ نور سحر کا وہ ہویدا شیح جبل الشمس ضیار خفی ہویدا
اشجار پہ تھے زمزمہ بلبلِ شیدا سرخی وہ شفق کی افق چرخ سے پیدا

لرزہ جو تنِ خسروِ خاور میں مگر تھا
سو بہرِ سلامت پہ زوال آنے کا ڈر تھا

چمکا صفتِ شعلہ جو وہ مہرِ جہاں تاب — شبنم کی طرح سیمِ کواکب ہوئی بے آب
مائل بہ سپیدی ہوا رنگِ رخِ مہتاب — اور دیدۂ مردم سے سفر کرنے لگا خواب

طاقت نہ رہی شمع میں سوزِ جگری کی
پروانے سے رخصت تھی چراغِ سحری کی

وہ سردِ ہوا صبح کی وہ نور کا عالم — اور زمزمے مرغانِ خوش الحاں کے وہ باہم
وہ سبزۂ صحرا پہ پڑے گوہرِ شبنم — اور صبح کی نوبت کی صدا آئی وہ ہر دم

نالے کی جو شہنا میں صدا تھی تو بجا تھی
وہ نوبتِ قتلِ پسرِ شیرِ خدا تھی

(انیس)

گھوڑے کی تعریف

جب کوند کر سمند پہاڑوں سے وہاں گیا — ثابت ہوا نہ کچھ کدھر آیا کہاں گیا
جھاڑیں جو پتلیاں تو نظر سے نہاں گیا — گھوڑا براق بن کے سوئے آسماں گیا

غل تھا وہ آکے دیکھ لے اِس بادپا کے پاؤں
دیکھے نہوں زمانے میں جس نے ہوا کے پاؤں

سرعت میں شرمسار نسیمِ سحر ہوئی — آنکھوں میں پھر گیا نہ کسی کو خبر ہوئی
تن سے عرق کی بوند جو ٹپکی گہر ہوئی — جب خاک اُڑی اِدھر تو اُدھر اُگی چنور ہوئی

گھوڑا نہ کہیے تختِ سلیماں روانہ تھا
اُس کے لئے تو جنبشِ رگ تازیانہ تھا

باریک جلد وہ کہ مجل تاقم و حریر — مشکیں پہ ند آ بھوئے [illegible] شیر گیر

جھپٹے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر　　آتش مزاج بادیہ پیما فلک مسیر

یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اُس راہوار کے

جیسے پیادہ چلتا ہے آگے سوار کے

تلوار تھی جو ابر تو گھوڑا بھی برق تھا　　شکلِ عروسِ زیورِ خوبی میں غرق تھا

کچھ اُسمیں اور ابر میں اصلا نہ فرق تھا　　دو گام اُسکو فاصلۂ غرب و شرق تھا

پاکر تھے موتیوں کے عرق جسمِ پاک پر

آئی تھی بادِ تند فرس بن کے خاک پر

تلوار کی تعریف

تھا صورتِ آئینہ تمام اُس کا بدن صاف　　خوں پیتی تھی پہ دیکھو تو منہ صاف دہن صاف

چلتی تھی جو سو سو سن پہ نکلتا تھا سخن صاف　　ہوتیں تو وہ چار دب کہ کردیتی ہوں رن صاف

نا اہل ہیں نامرد ہیں ناپاک ہیں اعدا

گو برقِ غضب ہوں خس و خاشاک ہیں اعدا

مغفر سے جھلم کاٹ کے گردن میں در آئی　　گردن سے سرکتا تھا کہ جوشن میں در آئی

جوشن سے گزرتا تھا کہ بس تن میں در آئی　　تن سے ابھی اُتری تھی کہ توسن میں در آئی

بچتا کوئی کیا تیغِ قضا رنگ کے نیچے

اک برقِ غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

پیری کبھی گر خود میں شہ کر نکل آئی　　ٹھہری کبھی غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی

کھٹی جو زرہ موج میں جاکر نکل آئی　　منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی

کیا ڈر اُسے طوفاں کا جو چالاک ہو ایسا

جب باڑھ پہ دریا ہو تو پیراک ہو ایسا

۵

خواہانِ طرب سہی جسے ادراک نہیں   آرام تہِ گنبدِ افلاک نہیں
پیمانۂ گردوں میں کہاں بادۂ عیش   جز درد تہِ جام یہاں خاک نہیں

ناسخ

بیگانہ یہاں ہر اک یگانہ دیکھا   اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا
جس کو دیکھا غرض غرض کا اپنی   دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا

۲

دنیا میں کب انسان کی حاجت نکلی   حسرت ہی رہی کوئی نہ حسرت نکلی
جیتے تھے قیامت کی توقع پہ ہم   خود وقت کی محتاج قیامت نکلی

انیس

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں   یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے   حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

۲

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لئے   جرأت واجب ہے کج کلاہی کے لئے
لازم ہے کہ ہو اہلِ سخن تیز زباں   تلوار ضرور ہے سپاہی کے لئے

۳

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے   ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہِ گریہ پوچھی تو کہا   رونا دنیا اپنی بے ثباتی کا ہے

۴

مانا ہم نے کہ عیب سے پاک ہے تو   معذور نہ ہو جو اہلِ ادراک ہے تو
بالفرض مگر آسماں ہے تیرا مقام   انجام کو سوچ لے کہ پھر خاک ہے تو

۵

ویراں ہے کوئی گھر کہیں آبادی ہے　　راحت سے کوئی اور کوئی فریادی ہے
اک عشرت و غم کا ہے مرقع دنیا　　ماتم ہے کسی جا تو کہیں شادی ہے

۶

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے　　بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا　　جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

حالی

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ　　پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی　　پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

۲

احساں کے ہے گر صلے کی خواہش تم کو　　تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو گر احساں تو کرو عام اسے　　اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

۳

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال　　مہماں کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی　　اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

۴

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار　　باطن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر　　کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

۵

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال　　غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح　　جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا ۔ آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے ۔ انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

سیّد اکبر حسین اکبر

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو ۔ جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد ۔ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

۲

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے ۔ دیکھو نہ بہم عیب محبت ہے تو یہ ہے
صنعت بھی ہو دولت بھی ہو دلکو بھی ہو تسکین ۔ دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

۳

مسرت ہوئی ہنس لئے دو گھڑی ۔ مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا روز زیست ۔ سنا یا شب گور سے سو رہے

۴

یہ دربار ہے خالق دو جہاں کا ۔ ادب سے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے
نہ سمجھو کہ حاضر نہیں حق تعالیٰ ۔ یہ عالم تو دل آنکھیں جھکائے ہوئے ہے

۵

کہیں خوشیاں رہینگی دہر میں ایسے ہی تم ہونگے ۔ گذر کر وقت آئیگا نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے
امیدیں تو ہیں تو بھی صدمہ پہونچتا ہے ۔ امیدیں جو کریگا کم اسے صدمے بھی کم ہونگے

۶

موت سے وحشت بشر کا اک خیال خام ہے ۔ اہل فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے
اس تجارت گاہ دنیا کا کہیں کیا تجھ سے حال ۔ کارخانے سب خدا کے ہیں ہمارا نام ہے